مقالاتِ عثمانی

مولانا شبیر احمد عثمانی

ادارہ فروغِ اردو لاہور

ملنے کا پتہ:-

ادارہ فروغِ اُردو - لاہور

کوہِ نور بک ڈپو - لاہور

بار اوّل | اپریل ۴۷ء | قیمت ۸؍

عنایت حسین مالک کوہِ نور بکڈپو نے تعلیمی پرنٹنگ پریس بیرون اکبری دروازہ سے چھپوا کر شائع کی۔

ترتیب

حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی وہ فاضلِ اجل اور عالم بے عدیل ہیں، جن کے علمی تبحر اور سیاسی بصیرت کا ایک زمانہ قائل اور معترف ہے۔ آپ کے خطبات کو جو خصوصیت دیگر علمائے کرام کی تقاریر سے ممیز کرتی ہے، وہ صالح دلائل کا تسلسل اور اندازِ خطاب کی محبوبیت ہے علمار کی جماعت سے باہر بہت کم اصحاب کو اس خوشگوار حقیقت کا علم ہے کہ حضرت علامہ محض خطبہ و تقریر پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ آپ نے دینی مسائل اور حکمت و فلسفہ کے نکات پر ایک جہاندیدہ ادیب اور ایک پختہ کار حکیم کی حیثیت سے قلم اٹھایا ہے۔ اور چند ایسے رسائل تحریر فرمائے ہیں، جن کی افادیت سے کسی زمانے میں انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جن کی اہمیت مسلمانانِ ہند کے اس دورِ ابتلا میں بہت بڑھ گئی ہے

ہمیں ان مختلف رسائل کو ایک مجموعہ کی صورت میں پیش کرتے ہوئے مسرت کے علاوہ فخر بھی محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم حضرت علامہ کی بے مثال شخصیت کے ایک ایسے دلنواز رُخ کو اجاگر کر رہے ہیں۔ جو صرف نیا ہی نہیں، بلکہ مسلمانانِ ہند کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ موضوعات کے تنوع، دلائل کی صداقت اور تمام مضامین میں اعتماد و یقین کی سرایت ہوئی رو کو تو شاید اکثر حضرات محسوس فرمائیں، لیکن ہم اُن اصحاب کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ جو علامہ صاحب موصوف کے ہر مقالہ کی بنیاد پہ اسلام، فلسفہ اور مسلمانوں کے دیگر سماجی مسائل کو مزید تشریح سے پیش کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ حضرت علامہ خود ہی اسلامی دنیا کو چند ایسی تصنیفات مہیا فرما سکیں، جو آپ کی جدید سیاسی مصروفیتوں کے نچوڑ اور اسلام کی مجتمع ہوتی ہوئی قوتوں کے لئے ایک منضبط لائحہ عمل پر مشتمل ہوں، ہمیں امید رکھنی چاہیئے اور دعا کرنی چاہیئے؛

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اسلام

یہ مبارک عنوان جس کی بقدر مناسب تفصیل لکھنے پر آج میری خوش قسمتی اور سعادت نے مجھ کو آمادہ کیا ہے۔ جس قدر اپنے ملفظ کی حیثیت سے چھوٹا۔ مختصر اور مفرد دکھائی دیتا ہے۔ اسی قدر اپنی معنوی وسعت کے اعتبار سے تفصیل طلب اور دقت خیز ہے۔ اسلام کی تاریخ اس کی صداقت اس کے فوائد اسکے برکات اور اسکی ترقی و تنزل کی داستان بیحد پُر نتائج اور دلچسپ ہونے کی وجہ سے اگرچہ اس قلیل وقت میں پوری نہیں ہو سکتی۔ جو اس تحریر کے لکھنے میں میں اپنے پاس سے صرف کر سکتا ہوں۔ لیکن محض یہ نیت کر کے کہ ایسے مقدس اجلاس کے سلسلہ میں مضامین کا اس طرح کے اہم اور ضروری عنوان سے خالی رہنا بھی شاید بہتر علامت نہ ہو۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنی بے بضاعتی او سکم مائیگی کا اقرار کر دینے کے بعد بکمال اختصار اسلامی اصول کو جس طرح پر کہ میں سمجھا ہوا ہوں۔ اپنی قوم اور احباب کے روبرو پیش کر دوں

تاکہ ہمارا یہ مجمع اسلام کے بابرکت تذکرہ کے ثواب سے محروم نہ رہے اور مولانا عبیداللہ صاحب کے حکم کی (جنہوں نے میرے دل میں اس مضمون کی تحریک پیدا کی) تعمیل نہ کرنے کا بھی مجھکو گنہگار نہ ہونا پڑے ؂

اس میں کچھ شک نہیں کہ مجھ سے پہلے سینکڑوں مصنفین نے اسی مضمون پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ اور ہزاروں فضلا اسی عنوان پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں اور لاکھوں پیرایوں میں انہیں مسائل کا اعادہ ہو چکا ہے۔ اور بے شمار آدمی اس موضوع پر اپنی جادو بیانی کا ثبوت دے چکے ہیں۔ اور ایسی حالت میں ہماری اس ناچیز تحریر کی کوئی وقعت قائم ہونا نہایت مشکل ہے۔ لیکن ہم خوش ہیں کہ ہم کو اپنے مضمون کی وقعت قائم کرنے کی خلش ہرگز دامنگیر نہیں ہے۔ اور نہ ہمارے دل میں یہ تمنا ہے کہ ہمارے ہر ہر جملہ پر واہ واہ کے نعرے بلند کئے جاویں یا احسنت اور مرحبا کی صداؤں سے آسمان سر پر اٹھایا جاوے۔ یا بات بات پر سبحان اللہ اور الحمدللہ کا ورد پڑھا جاوے ؂

ہماری صرف ایک ہی آرزو ہے اور اسی میں کامیاب ہونے کو ہم اپنی محنت کا اصلی صلہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ جو دلی خیالات

ہم نہایت صفائی کے ساتھ عام پبلک میں پیش کریں گے اگر سچائی اور
راستی پر مبنی ہیں - اور درحقیقت اُن خیالات کا ماننے والا حیاتِ
ابدی کا مستحق ہو سکتا ہے - تو اہل عقل اُن کی تصدیق فرما کر ہم کو راحت
اور تسلی بخشیں - اور اگر فی الواقع ان خیالات کو ہم نے اپنی غلطی
سے دل میں جما لیا ہے یا اُن کے تسلیم کرنے میں اوہام کی آمیزش
لگی ہوئی ہے یا کسی کی کورانہ تقلید اور بیجا حسن ظن کیوجہ سے انہوں
نے ہمارے دل میں راہ پالی ہے تو براہ نوازش ہماری غلطیوں پر
ہم کو متنبہ فرما کر ایک گم گشتہ راہ کی ہدایت کا اجر جو خدا کے یہاں
سے مل سکتا ہے - اپنے دفتر حسنات میں درج کرانے کی کوشش کریں -
سامعین کو یہ میں اطمینان دلاتا ہوں کہ میری تحریر کا عام ماخذ
اگرچہ اکابر سلف کی تصنیفات سے باہر نہ ہوگا - لیکن اس کا پیرایۂ
بیان اور ترتیبِ دلائل جداگانہ طرز پر ہو گی - اور شاید اصول
اسلام کے ضمن میں بعض ایسے مضامین بھی نظر پڑیں گے جن کی اس
قدر تفصیل دوسری کتابوں میں نہ مل سکے گی - کیونکہ اسلام کی فیض
رسانی ہر خاص و عام اور ہر عالم و جاہل کیواسطے ہے، اور اسکے
اسرار اور فیوض عامہ کسی شخص پر ختم ہونے والے نہیں ہیں - وُہ
اسلام جسکے چشمہ سے قطرہ قطرہ آبحیات نکل کر نکلا ہے - جسکے خزانہ

ہیں سے علم و معرفت کے لعل و جواہر تقسیم ہوتے رہے ہیں۔ جسکی عالمگیر روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ جگمگا اُٹھا ہے وہ اپنے اخیر زمانہ کے پیرؤں کو اپنی فیاضی سے محروم رکھے۔ اور اپنے ایک سچے مناقب و کمالات بیان کرنے والے کی کچھ بھی امداد نہ کرے۔ یہ بالکل قیاس سے باہر ہے میں یقین کرتا ہوں کہ میری تقریر یہ کا روشن عنوان اس مضمون میں خود میری رہبری کرے گا۔ اور اگر اور کچھ نہیں تو اس سے بھی کیا کم کہ ایک ایسے اولوالعزم مذہب کے نام لینے ہی سے میری تقریر یہ کی کافی حد تک عزّت کی جاسکے گی۔

یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اسلام کے یا اور کسی مذہب کے غیر متناہی فروع کا احاطہ کرنا اور ہر ایک جزئی جزئی کو دلائل یا قیاسات سے ثابت کر دکھانا صرف دشوار ہی نہیں، بلکہ فضول اور بیکار بھی ہے۔ کیونکہ جب ایک مذہب کے تمام اصول بروئے عقل و انصاف تسلیم کر لئے گئے تو فروعات اور جزئیات کے ماننے میں انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی۔ اس لئے ہر مذہب و ملّت کی جانچ اسکے اصول اور کلیات ہی کی صداقت سے کی جائیگی۔ اور اس کی حقانیت کی پڑتال کا یہی بہتر اور آسان ذریعہ قرار پائیگا۔

اسی قید کو ملحوظ رکھکر ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ اسلام کے اصول

بلکہ اصل الاصول کہاں تک عقل صحیح اور فطرت سلیمہ کے زیرِ حمایت ہیں۔ وہ انسان کی فلاح و بہبود کی کس حد تک کفالت کرسکتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے شاندار مذاہب سے انکو کیا فوقیت اور امتیاز حاصل ہے۔ انہوں نے بندوں کے دلوں میں خدا کی کیسی قدر و منزلت قائم کرائی ہے اور پیغمبروں کا کس قسم کا احترام منوالے کی کوشش کی ہے اگر ہم اپنی اس تحقیق میں جس کا مدار محض نیک نیتی پر ہوگا، خاطر خواہ کامیاب ہوگئے۔ تو یوں سمجھو کہ ہم نے اپنی زندگی کا ایک بڑا بھاری فرض ادا کرلیا اور بہت سے دوستوں کو جو مجھ ہی جیسے ہوں، سخت محنت اور کد و کاوش اور دوسری سے نجات دلادی اور ہزارہا بندگان خدا کو تفتیش مذاہب میں ایک طویل جانکاہی سے بچا دیا۔

ہاں یہ بات بار بار یاد دلانے کے قابل ہے کہ اس مختصر تحریر میں جو کچھ مذکور ہوگا، وہ طویل و عریض بیانات نہ ہونگے۔ نہ کثیر التعداد علماء کی رایوں کا استقصا اور موازنہ کیا جائے گا۔ اور نہ بے انتہا کتابوں کے حوالے درج ہونگے۔ کیونکہ ان مباحث کیلئے ہم نے خود ایک ایسی مبسوط اور مستقل تصنیف کا ارادہ کر رکھا ہے۔ جس کو ہماری اس تحریر سے وہی نسبت ہوگی، جو کہ حضرت مولانا محمد قاسم

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر دلپذیر کو اُن کی حجۃ الاسلام سے ،
اس تحریر میں جو کچھ خیال ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ اصول اسلام
کی تشریح میں بعض کار آمد اور مفید عام مضامین نہایت ایجاز
کے ساتھ لکھدیئے جائیں۔ جن سے ایک طرف تو ہمارے مذہبی
خیالات کا عام اندازہ ہو جائیگا، اور دوسری طرف اس مفصل کتاب
کی (جس کا قصد میں نے ابھی ظاہر کیا) نوعیت مضامین سے واقف
ہونے اور طرز تحریر کے پرکھنے کا بھی مشتاقوں کیواسطے یہ تحریر
ایک نمونہ بن جائے گی۔

بلاشبہ اس قدر وسیع عنوان (اسلام) کو ان چند اوراق میں
کھپا دینا دریا کو کوزہ میں بند کرنے سے ہرگز کم نہیں ہے۔ مگر اسلام
کے تعجب انگیز اعجازوں میں سے یہ بھی ایک ہے جس پر ڈاکٹر
گسٹاولیبان وغیرہ محققین یورپ نے بھی حیرت ظاہر کی ہے۔ کہ
وہ جس قدر طویل ہے۔ اُسی قدر مختصر بھی ہے۔ اور جتنا دشوار ہے
اتنا ہی آسان بھی ہے۔ اور جیسا کہ اس سے ایک حکیم اور ارسطوے وقت
فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایسے ہی ایک عامی اور افریقہ کا ایک وحشی
بھی اپنا کام نکال لیتا ہے۔ اسلام کے برگ و بار اگرچہ بہت دور دور
تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ان سب کی جڑ صرف ایک کلمہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے - ان ہی دو جملوں میں تمام اسلامی معتقدات کا خلاصہ اور لب لباب نکل آتا ہے اور یہی کلمہ شریعت کا اسلام کا جوہر ایمان کی روح، راستی کا نشان، ہدایت کی زندہ تصویر اور علوم حقائق کا سرچشمہ ہے - اسی کلمہ سے دائمی راحت حاصل ہوتی ہے - اسی سے روحی مسرت اور حقیقی آرام ملتا ہے - اسی کی بدولت مسلمان خیر الامم کے لقب سے سرفراز کئے گئے ہیں اور اسی کے چھوڑنے سے آج ان کو قعر ذلت میں گرا دیا گیا۔

لیکن جبکہ یہ کلمہ کل اہل اسلام کے نزدیک ایسی نعمت عظمی اور رحمت کبریٰ تصور کر لیا گیا، تو نہایت ضروری ہے کہ اسلام پر مضمون لکھنے والا اول اسی کی حقیقت کے واضح کرنے میں اپنا وقت صرف کرے اور جب تک اس کی کامل تحقیق سے فارغ نہ ہو جائے، اسی کو مطمح نظر بنائے رکھے، چنانچہ میرا ارادہ بھی اس وقت یہی ہے کہ میں اس کلمہ کی تحلیل و تقسیم کر کے اس کے ہر ہر جزو پر مستوعب بحث کروں۔

جہانتک غور کیا گیا اس کلمہ کے دو جزو نظر آئے ان میں سے پہلا جزو جسکے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی چیز معبود بننے کی صلاحیت و استحقاق نہیں رکھتی، فی الواقع تین مضمونوں پر مشتمل ہے - خدا کا وجود ہونا، اس کا قابل عبادت ہونا - اور اس کی خدائی میں کسی کا

شریک نہ ہونا۔

پہلا مضمون یعنی خدا کا وجود

یہی وُہ مضمون ہے جس کی تائید تمام ادیان و مذاہب نے یک زبان ہو کر کی ہے۔ اور جس پر بلا نکیر اہل ملل کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ ملاحدہ جن کا دوسرا نام منکرین مذہب بھی ہے۔ زور شور کے ساتھ اسی مضمون کی تردید پر تلے ہوئے ہیں اور مادیین (میٹریلسٹ) کے گروہ سے ہماری سب سے بڑی معرکہ آرائی اسی میدان میں ہو سکتی ہے۔ یورپ میں مادہ پرستوں کی جو جماعت تیار ہوئی ہے۔ اُس نے آجکل مذہبی دنیا میں ایک عام ہلچل ڈال رکھی ہے۔ اور نہایت بیباکی کیساتھ اس کا اظہار کیا ہے۔ کہ خدا کا وجود ہرگز کوئی واقعی وجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ بھی ان وہمی اشیاء میں سے ایک شے ہے جنکو انسانی تخیل نے بدو فطرت میں قوانین طبعیہ سے مرعوب ہو کر اختراع کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس فرضی خدا نے لوگوں کے دماغوں پر ایسا کچھ قبضہ اور اقتدار حاصل کیا کہ انہوں نے اپنے تمام اعمال و افعال اور تمام ارادوں بلکہ تمام کائنات کی عنان حکومت اسی کے ہاتھ میں دیدی۔ اور محض اپنی خوش اعتقادی سے یہ سمجھ لیا کہ دنیا میں جو کچھ کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے

اور جسقدر حوادث پیش آتے ہیں یا واقعات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک پتہ بھی اگر ہلتا ہے، اور ایک تنکا بھی اپنی جگہ سے سرک جاتا ہے تو بغیر اس کے حکم اور ارادہ کے نہیں ہو سکتا۔

مادہ پرست کہتے ہیں ، کہ اہل مذاہب سے کوئی پوچھے کہ تم کو ایک ایسی مافوق الفطرت ہستی کے ماننے پر کس چیز نے مجبور کیا ہے، کیا عالم میں جو حوادث واقع ہوتے رہتے ہیں یا زمانہ جو پلٹیاں کھاتا ہے، یا وجود کی آمد و شد جو اکثر چیزوں میں مشاہدہ کی جا رہی ہے۔ تمہارے اس فرضی خدا کے سوا اور کسی سبب سے ربط نہیں کھا سکتے۔ یا مادہ جو مع اپنی حرکت کے ازلی و ابدی ہے، ان ضرورتوں کو سرانجام نہیں دیسکتا ۔ خواہی نخواہی تمکو ایک موہوم اور خارج از عقل ہستی کے سامنے جبہ سائی ضروری معلوم ہوئی۔ اگر ہم سے پوچھو تو یہ سب خیالات ارباب مذاہب کی ناواقفیت اور کوتاہ فہمی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ زمانہ حال کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ عالم کے تمام سماوی اور ارضی اشیاء کی اصل دو چیزیں ہیں مادہ اور اسکی قوت (حرکت) اور ازل سے دونوں تلازم کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ مادہ اور اسکی حرکت میں انفصال یا جدائی ہو سکے اور ایک بغیر دوسرے کے پایا جائے۔ مادہ سے وہی اجزاء دیمقراطیسی مراد ہیں۔ جو اس خلاء میں بھرے ہوئے ہیں۔ اور جو اگرچہ ذہنی قسمت

قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن خارجی تقسیم کا ان میں مساغ نہیں۔ ان ہی ذرات کو ایثر (ایتھر) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور انہیں کے دوامی حرکت کیوجہ سے اجرام سماوی یعنی ستارے اور کائنات ارضی یعنی جمادات و نباتات اور حیوانات جو پہلے سے موجود نہ تھے۔ وجود میں آئے ہیں۔ اور ان چیزوں کا مادہ اور اس کی حرکت سے بننا بھی ویسا ہی ہے۔ جیسا کہ کوئی معلول اپنی علت سے بے اختیار بن جاتا ہے۔ چنانچہ ان اشیاء کی پیدائش میں مادہ اور اس کی حرکت کو نہ کسی قسم کا ادراک ہوتا ہے۔ اور نہ ان میں قصد و ارادہ پایا جاتا ہے۔ اور جب ہم کرات عالم اور تمام مخلوقات کے وجود کو مادہ اور اس کی حرکت سے منسوب کر سکتے ہیں۔ تو نہ ہم کو کسی فرضی خدا کی حکومت ماننی پڑتی ہے۔ اور نہ اپنے کو مذہبی طوق و سلاسل میں پھانسنے کی ضرورت رہتی ہے۔ غرض ہمارے نزدیک مادہ بھی قدیم ہے اور اس کی حرکت بھی قدیم ہے اور جو سلسلہ صورتوں کا مادہ کے اندر قائم رہتا ہے وہ بھی قدیم ہے۔ اگرچہ صورت شخصیہ علیحدہ علیحدہ حادث ہے بہرحالت میں ہم کو خدا کے وجود کی اصلا ضرورت نہیں۔ بلکہ مادہ اور اسکے قوانین فطریہ ہی عالم کی ہستی اور بقا کی ضمانت ہیں۔"

ہم کہتے ہیں کہ بیشک مادیین نے بزعم خود کائنات کے وجود کا ایک خاص سبب پیدا کیا۔ لیکن ابھی تک جس منتظم اور مرتب کائنات کے سبب کی ہم کو تلاش تھی۔ اس میں کامیابی نہیں ہوئی (انہوں نے ہمکو

ایک نہایت علیم وحکیم اور ج صفت موصوف خدا سے علیحدہ کر کے ہر
ایک ایسے خدا پر قناعت کرنیکی رائے دی جو بالکل اندھا، بہرا، گونگا۔
اور بے حس و بے شعور ہے جس کا کوئی کام نہ قصد واختیار سے ہو
سکتا ہے۔ نہ مصنوعات میں کسی قسم کی ترتیب اور تناسب پیدا کرنے
پر قادر ہے۔ نہ اس میں سمجھ کا مادہ ہے نہ وہ کسی قاعدہ قانون سے
واقف ہے۔ نہ اس کو امور انتظامیہ کی اطلاع ہے۔ حالانکہ جس عالم
کے فاعل کا ہم کو کھوج لگانا تھا۔ وہ عالم کائنات کا ایک ایسا مجموعہ
ہے جس کے ہر ہر جزو میں بیش قیمت حکمتیں ودیعت رکھی ہوئی ہیں
جس کے عجیب وغریب اسرار کا مشاہدہ کرتے کرتے عقل انسانی تھک
جاتی ہے اور جس کے بہت تھوڑے حصہ کا تتبع کر لینے سے حکماء کو خصوصاً
ان مادیین کو یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ مظاہر فطرت کی جسقدر پہیلیاں
ہم معلوم کر سکے ہیں۔ وہ اُس سے بہت ہی کم ہیں۔ جو ابتک معلوم نہیں ہو
سکیں۔ علم تشریح، علم الافلاک، علم الحیوانات، علم نباتات، اور
علم طبقات الارض کے ماہرین سے دریافت کرو۔ جو رازہائے قدرت
تم نے موجودات عالم میں آجتک دریافت کئے ہیں۔ وہ کس قدر ہیں۔
اور اُن کی حفاظت کے واسطے کتنے دفتر اور کتب خانے تم کو
درکار ہوئے ہیں۔

پھر عالم کے احوال میں جو تفاوت اور حاجتمندی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس پر بھی ایک نظر ڈالو اور ہر ہر شے کی پستی و ذلت کو جس سے خدائے تعالیٰ کی پر حکمت جبروت کا سبق حاصل ہوتا ہے، بنظرِ تعمق ملاحظہ کرو تاکہ تمکو معلوم ہو کہ یہ کارخانہ یوں ہی بے سرا اور بخت و اتفاق سے پیدا ہونے کے قابل نہیں ہے۔

آسمان، چاند، سورج اور ستاروں کو دیکھئے کہ ایک حال پر قرار نہیں۔ کبھی عروج ہے، کبھی نزول، کبھی طلوع ہے، کبھی غروب۔ کبھی نور، کبھی گہن، آگ کو دیکھئے کہ بیقرار ہے تھامے نہیں تھمتی۔ ہوا کا یہ حال ہے کہ کبھی حرکت کبھی سکون اور حرکت بھی ہے تو کبھی شمال، کبھی جنوب، کبھی پورب اور کبھی پچھم کو ماری ماری پھرتی ہے۔ ادھر پانی کا کرہ ہوا کے دھکوں سے کہیں کا کہیں نکلا جاتا ہے۔ اور زمین کو بھی پستی کے سوا لاچاری اس درجہ کو ہے کہ اس پر کوئی دوڑتا ہے کوئی بھاگتا ہے۔ کوئی کھودتا ہے، کوئی بھرتا ہے۔ اسی طرح نباتات کبھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ کبھی بڑے کبھی تر ہوتے ہیں۔ کبھی خشک ہو جاتے ہیں۔ اور اس پر ایک زمین ایک پانی اور ایک آفتاب ہونیکے باوجود اسقدر مختلف پھول اور پھل لاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتا۔ علیٰ ہذا القیاس حیوانات خصوصًا بنی نوعِ انسان باوجودیکہ سب اربع عناصر ہی سے

مرکب ہیں شکل وشمائل خو، بو اور خاصیت مزاج میں اتنے مختلف معلوم ہوتے ہیں کہ حد ادراک سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ بھوک، پیاس صحت مرض، گرمی، سردی اور حرص وہوا وغیرہ کے بہت سے موکل انکے پیچھے ایسے لگا دیئے ہیں کہ جس سے شرف حیات بھی خاک میں مل گیا۔ اور حضرت انسان کے پیچھے تو اتنا لشکر کا لشکر خواہشات اور حاجات کا متعین ہوا کہ جس نے اس کی فہم و دانش کو ناچار کر کے تمام شرافت و عزت کو ملیا میٹ کر دیا۔ دوسرے حیوانات تو صرف کھانے پینے ہی کے محتاج ہیں۔ لباس مکانات، سواری، عزت، منصب، جاگیر، میٹھے، کھٹے، نمکین کی کچھ پرواہ نہیں رکھتے۔ لیکن انسان کو بغیر ان چیزوں کے بھی زندگی بسر کرنا محال یا دشوار ہے۔ بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس میں کوئی خوبی اور کمال زیادہ تر تھا اسی کو اوروں کی نسبت زیادہ قیود میں پابند کر رکھا ہے۔ اور یہ ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ بادشاہ اگر غریبوں کو قید کرتے ہیں۔ تو کئی کئی قیدیوں کو ایک محافظ سپاہی کفایت کرتا ہے۔ اور اگر کوئی بادشاہ یا امیر ان کی قید میں آجاتا ہے۔ تو گو اُسے تعظیم سے رکھیں۔ لیکن اس پر بہت بہت پہرے اور بڑے بڑے بہادر حفاظت کیلئے مقرر کیا کرتے ہیں۔

بہر حال جبکہ ایسے ایسے اشرف اجزاء عالم اس ذلت و خواری میں گرفتار

ہیں۔ جس کا ذکر اوپر ہوا۔ ایسے مجبور ہیں کہ ایک دم کو بھی ان قیودات ہے کے شکنجوں سے وہ علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ تو بلا شبہ ان کے سر پر کوئی ایسا منتظم حاکم ہے۔ جو ان سے ہر وقت قیدیوں کی مانند یہ سب بیگاریں لیتا ہے۔ اور چین سے نہیں رہنے دیتا۔ تا کہ یہ مغرور نہ ہو جائیں۔ اور اوروں کو اُن پر بے نیازی کا گمان نہ پیدا ہو۔ بلکہ اُن کو ایسا ذلیل وخوار دیکھکر یہ خود بھی اور دوسرے لوگ بھی خدا کو پہچانیں۔ اور سمجھ لیں کہ یہ اُسکے انتظام کی خوبی ہے۔ کہ ان سے طرح طرح کے کام لیتا ہے۔ اور اُن پر قسم قسم کے احوال بھیجتا ہے۔ اور یہ ایسا قصہ ہے جیسا کہ ایک بیدار مغز اور مدبر حاکم اپنے ماتحتوں کو فارغ نہیں رہنے دیتا اور اس پر بھی کبھی کہیں کبھی کہیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

یورپ کا ایک محقق راٹین بھی انہیں مناظر قدرت کو دیکھ کر کہتا ہے" کہ اے آسمانو! مجھ کو خبر دو۔ اے دریاؤ مجھکو بتاؤ۔ اے زمین مجھ کو جواب دے۔ اے بے انتہا ستارو تم بولو۔ کہ کونسا ہاتھ ہے۔ جس نے تم کو افق میں تھام رکھا ہے۔ اے شب چاردہ کس نے تیری تاریکی کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ تو کس قدر پُرشان ہے۔ اور کس قدر عظمت مآب ہے۔ تو خود بتا رہی ہے۔ کہ تیرا کوئی صانع ہے جس نے تجھ کو بغیر کسی زحمت کے بنایا ہے۔ اس لئے تیری چھت کو قبہائے نور سے مرصع کیا

ہے جسطرح کہ اُس نے زمین پہ خاک کا فرش بچھایا ہے۔ اور گرد کو ابھارا ہے۔ او مژدہ رسان سحر۔ او نیر شگرف۔ او ہمیشہ روشن رہنے والے ستارے او آفتاب درخشاں سچ بتا تو کس کی ادائے طاعت کیلئے محیط کے پردے سے باہر آتا ہے۔ اور نہایت فیاضی کے ساتھ اپنی روشن شعاعیں عالم پر ڈالتا ہے۔ اے پر رعب سمندر اے وہ کہ غضبناک ہو کر زمین کو نگل جانا چاہتا ہے کس نے تجھ کو محبوس کر رکھا ہے۔ جس طرح شیر کٹھرہ میں قید کر دیا جاتا ہے۔ تو اس قیدخانہ سے بیفائدہ نکلجانے کی کوشش کرتا ہے۔ تیری موجوں کا زور ایک حد معین سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکتا؟ ؛

ملٹن اڈورڈ کہتا ہے کہ" انسان اسوقت سخت حیرت زدہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر اور ناطق مشاہدات کے ہوتے ہوئے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ تمام عجائبات صرف بخت و اتفاق کے نتائج ہیں۔ یا دوسری عبارت میں یوں کہنا چاہیئے کہ مادہ کی عام خاصیت کے نتائج ہیں۔ یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں جنکو لوگوں نے علم المحسوسات کا لقب دیا ہے۔ علم حقیقی نے ان کو بالکل باطل کر دیا ہے۔ فزیکل سائنس دان کبھی اس پہ اعتقاد نہیں لا سکتا۔" ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ" یہ اسرار جو روز بروز زیادہ دقیق ہوتے جاتے

ہیں۔ جب ان پہ زیادہ بحث کرتے ہیں۔ تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے۔ کہ انسان کے اوپر ایک ازلی وابدی قوت ہے۔ جس سے تمام اشیاء وجود میں آتے ہیں۔" پروفیسر لینا کہتا ہے۔ وہ خدائے اکبر جو ازلی ہے۔ جو تمام چیزوں کا جاننے والا ہے۔ جو ہر چیز پہ قادر ہے۔ اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میں مبہوت اور مدہوش ہو جاتا ہوں۔"

اب ان سب کے جواب میں مادہ پرست کہتے ہیں کہ یہ تمام عمدہ انتظام اور مضبوط قاعدے جو دنیا میں جاری ہیں۔ یہ سب بھی مادہ اور حرکت کی ہی کارسازیاں ہیں۔ اور مادہ اگرچہ خود نہیں جانتا۔ مگر خود بخود اس سے بے سوچے ایسے ایسے حیرت انگیز قوانین اور اصول بن جاتے ہیں۔ جن کی اس عالم کو ضرورت رہتی ہے۔ اور جس پہ نظام عالم کا دارومدار ہے۔ لیکن ان حضرات سے اگر کوئی یہ کہے کہ ہندوستان کے کسی گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا اور بچہ پیدا ہوتے ہی اُسنے نہایت فصیح و بلیغ تقریر شروع کی اور وہ علوم و معارف اس کی زبان سے ظاہر ہوئے ہیں۔ جن کی خبر نہ ارسطو کو ہوئی تھی۔ نہ افلاطون کو، نہ بیکن کا ذہن وہاں تک پہنچا تھا۔ اور نہ نیوٹن کا نہ رازی کو وہ مضامین خواب میں نظر آئے تھے۔ نہ امام غزالی کو تو یہ لوگ ہرگز اس کے بیان کی تصدیق نہ کر سکیں گے۔ بلکہ جو شخص اس عجوبہ کا

قصہ کی تصدیق کرے گا۔ اس کو بھی ان لوگوں کے یہاں سے مجنون دیوانہ خبطی اور پاگل کا خطاب ملے گا۔

تو کیا اے عقلمند و مادہ کی وہ سحر کاریاں اس واقعہ کی ندرت سے کچھ کم حیرت افزا ہیں۔ وہ بچہ جو ایک نامکمل انسان ہے۔ ان امور کی قدرت نہ رکھے جنکو چند تعلیم یافتہ مرد انجام دے سکتے ہیں۔ اور ایک جماد لاالعقل جس کو ذرہ برابر بھی ادراک و شعور نہیں تمام مخلوقات کی حفاظت اور زینت کے ایسے محکم دستور العمل تیار کرے۔ جن کو دیکھکر دنیا کے عقلاء حیران ہیں۔ اور جنکے اسرار و حکمت کی گہرائی کو سب ملکر بھی آج تک معلوم نہیں کر سکے۔ اگر اس پر بھی آپ یہی کہے جاویں کہ نہیں کچھ ہی ہو ان تمام قوانین کی واضع وہی مادہ کی بے اختیاری حرکت ہے۔ تو بقول علامہ حسین آفندی۔

دہماری اور آپ کی مثال ٹھیک اُن دو شخصوں کی سی ہوگی۔ جو کسی نہایت رفیع الشان اور مضبوط کوٹھی میں داخل ہوئے جسمیں متعدد کمرے اور نشستگاہیں پائی جاتی ہیں۔ دو دروازوں اور جنگلوں سے آراستہ ہو اُس کے برآمدے اور ڈیوڑھیاں بہت استحکام کے ساتھ بنائی گئی ہوں۔ اور کمروں میں اعلیٰ درجے کے فرش بچھے ہوئے ہوں۔ بڑے بڑے بلند تخت لگے ہوں۔ نہایت بیش قیمت برتن اس کے چاروں طرف

قرینے سے رکھے ہوں۔ مختلف گھڑیوں متعدد مقیاس الحرارۃ و مقیاس الہوا کے ذریعہ اس کی دیواروں کی زیبائش کیگئی ہو۔ غرض اس میں بود و باش کرنے کیلئے جتنے ساز و سامان ضروری ہوں سب ہی کچھ موجود ہوں۔ اُس کی چاروں طرف نہایت خوبصورت سیرگاہیں نظر آتی ہوں۔ گرد اگرد ایسی چمن بندی کی گئی ہو۔ جن میں درختوں کا صف باندھ کر کھڑا ہونا کیسا ہوں کو بھلا معلوم ہوتا ہو۔ قسم قسم کی پھولوں کی کیاریاں موقع موقع سے بنائی گئی ہوں۔ اُس کی نہروں اور جدولوں میں پانی شوخی سے بھرا ہو اُس کے مستحکم بنے ہوئے حوض لبالب بھرے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ عیش و آرام کے سب سامان مہیا ہوں۔ جو کہ انہیں دیکھے یہی کہے کہ فلاں حکمت پر مبنی ہے۔ اس چیز سے یہ فائدہ ہے اس کی یہ ضرورت ہے۔ اس کا بنانیوالا کیسا ذی اختیار اور خوش تدبیر تھا۔ جس نے کہ جو چیز بنائی ایک قرینے سے بنائی۔ اور جس شے کیلئے جو مقام تجویز کیا اُس کے لئے وہی مناسب تھا۔

اب ایسے مقام پر پہنچکر ان دونوں شخصوں میں سے ایک تو یہ کہنے لگا کہ صاحب اس میں ذرا شک نہیں کہ اس کا بنانیوالا ان ساری عجیب و غریب صناعیوں پر خوب ہی قادر تھا۔ اور ان کی تالیف و ترتیب کے طریقوں سے بھی بڑی واقفیت رکھتا تھا۔ جب اس نے انتہا درجہ

کی حکمت کے موافق اس کو اسقدر مضبوط اور استوار بنایا اور خوبی یہ کہ اس کے تمامی لوازمات کامل طور پر مہیا کر دیئے۔ تاکہ یہاں رہنا اور رکماحقہٗ عیش و آرام سے بسر کرنا ممکن ہو اور کوئی امر آسائش اور راحت میں مخل نہ ہونے پائے۔ اس کے بنانے والے کو اگرچہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں۔ اگر یہ بالکل یقینی امر ہے کہ اس میں علم و قدرت تدبیر و حکمت وغیرہ اوصاف جن کی کہ اس کوٹھی کے بنانے میں ضرورت پڑتی ہے، سب موجود تھے۔ باقی اس کوٹھی کے سازو سامان میں اگرچہ بعض چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کی حکمت میری سمجھ میں نہیں آئی، لیکن ان میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوگی۔ اگرچہ میں اس کو دریافت نہیں کر سکا۔ کیونکہ جن اشیاء کی حکمت میری سمجھ میں آگئی ہے میں نے اس سے اطمینان کر لیا ہے۔ کہ اس کا بنانیوالا بڑا حکمت والا ہے تو اس نے ان کو بھی خارج از حکمت و مصلحت نہ بنایا ہوگا۔

اب دوسرا شخص اپنے ساتھی سے کہنے لگا کہ اس کوٹھی کے وجود کا سبب جو تم نے بتلایا یہ درست نہیں، بلکہ ایک پہاڑی کی طرف (جو اس کوٹھی کے پاس استادہ تھی اور جس کی جڑ میں ایک پانی کا چشمہ جاری تھا) اشارہ کر کے کہا کہ اس پہاڑی کی چوٹی سے

اس قطعہ زمین کی جانب جس میں یہ کوٹھی واقع ہے۔ ہمیشہ زمانہ قدیم سے ہوا چلا کرتی ہے۔ یہی ہوا لاکھوں برس تک مٹی اور پتھروں کو پہاڑی سے منتقل کرتی رہی اور وہ سب چیزیں اس کی وجہ سے مختلف شکلوں پر اس قطعہ زمین میں جمع ہوتی رہیں۔ اور بارش کا پانی ہمیشہ اس میں کچھ تصرف کرتا رہا۔ کبھی اس کی شکل کچھ ہوگئی کبھی کچھ۔ اسی طرح کبھی وہ چیزیں مجتمع ہوگئیں اور کبھی پراگندہ اور ان کی اوضاع شکلوں میں ہوا اور بارش کی وجہ سے کچھ نہ کچھ تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ کروڑوں برس کا زمانہ گذرنے کے بعد اب اس کوٹھی کی باقاعدہ صورت بن گئی۔ جس میں کمرے، نشستگاہیں، دروازے، جنگلے، برآمدے، راستے، حوضیں اور نہریں سبھی کچھ پائی جاتی ہیں۔ رہا نہروں کا جاری ہونا۔ اس کی یہ صورت ہوئی کہ اس چشمہ سے جو کہ اس پہاڑی کی تلی میں واقع ہے ہمیشہ پانی بہ کر اس قصر کے صحن میں مختلف طریقوں سے جاری ہوا، کیا اس لئے پانی سے اُس کی مٹی گلتی رہی ہوا اور بارش کا اثر اس کے راستہ میں ہوتا رہا۔ شدہ شدہ لاکھوں برس کا زمانہ گذرنے کے بعد باقاعدہ نہریں اور حوضیں جاری ہوگئیں۔ اور ان میں پانی اس موجودہ انتظام کے ساتھ بہنے لگا۔ اب اس کے برتن گھڑیوں،

فرش اور مختلف قسم کے مقیاسوں کو لیجئے، اُن کی یہ صورت ہوئی کہ مسافروں کا قافلہ جو کبھی اس پہاڑ پر اس زمین میں اترا۔ تو قافلہ والوں کی یہ چیزیں اتفاق سے چھوٹ گئیں۔ اور ہوا اُن کو مختلف طرح پر ادہر اُدہر منتقل کرتی رہی۔ حتیٰ کہ سالہا سال کے بعد یہ نوبت پہنچی۔ کہ فرش باقاعدہ بچھ گئے۔ برتن قطاروں میں آراستہ۔ گھڑیاں اور مقیاس دیواروں پر آویزاں ہو گئے۔ یہی حالت ان درختوں اور پھلوں کی ہوئی۔ جو یہاں کی سیرگاہوں میں باقاعدہ لگے ہوئے ہیں ان کے بیج ہوا میں اڑ کر یہاں تک پہنچ گئے۔ اور اس زمین پر جم کر اُگ آئے۔ اور ہوا کی وجہ سے ادہر اُدہر منتقل ہوتے ہوتے باقاعدہ طور پر آراستہ ہو گئے۔ اور موجودہ حالت پر نظر آنے لگے۔

اب وہ شخص جس کے دماغ میں کچھ بھی عقل اور سر میں کچھ بھی انصاف ہے بے لاگ ہو کر ان دونوں بیانات کا فیصلہ کر دے۔ اور بے تعصبی کی راہ سے بتلا دے کہ اس کوٹھی کے تیار ہونے کا وہ سبب جو پہلے آدمی نے بتلایا ہے۔ عقل کے نزدیک ماننے کے قابل ہے۔ یا دوسرے شخص کی بیہودہ بکواس۔ اور اسی طرح عالم کی پر اسرار ہستی کے واسطے ایک قادر مطلق اور علام الغیوب خدا کا اعتقاد رکھنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ یا ایک جاہل اور اپاہج مادہ کا۔ اور ایسی صورت

ہیں اربہا ارب انسانوں کی رائے رجو آدم علیہ السلام کے عہد سے
اس وقت تک گذرے ہیں اور جن میں بڑے بڑے حکما اور اولوالعزم
انبیار بھی شامل ہیں) صحت اور واقعیت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی
ہے۔ یا ہزار دو ہزار غافل اور بدمستوں کی ۔۔

بلاشبہ ہمارے زمانہ کے بعض عقلاء سے سخت غلطی ہوئی۔ کہ
انہوں نے ایسے ایسے اعلیٰ درجہ کے قوانین قدرت کو جن سے خدا تعالیٰ
کی حکمتوں اور صناعیوں کی بوقلمونی ظاہر ہوتی ہے۔ خدائے برتر کی
امداد کا محتاج نہیں سمجھا۔ بلکہ صرف ان قوانین میں جو حرکت مادّہ
سے پیدا ہوتی ہیں باہم توافق، تناسب ارابط، اتحاد پیدا کرنے کیلئے
خدا کے وجود کی ضرورت باقی رکھی۔ حالانکہ اس تناسب و اتحاد
کا باقی رکھنا بھی اسی مادہ اور حرکت کو کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا جس
نے ایسے ایسے غامض اور غیر متغیر قوانین عالم میں جاری کر
دیئے ہیں۔

تماشے کی بات یہ ہے کہ جیسا کہ مسلمانوں میں بعض علمار نے مادہ
پرستوں کی دھمکی سے مرعوب ہو کر مادّہ وغیرہ کو قدیم مان لیا۔ اسی
طرح بعض دوسری اقوام کے لیڈروں نے بھی یورپ کے ملحدوں
سے ڈر کر قدامت کے مسئلہ کو جزو مذہب بنالیا ہے اور اسی پر

مسئلہ تناسخ کی بھی نیو جمانا شروع کر دی - حالانکہ دنیا کی وہ پرانی کتاب جسپر یہ لوگ نہایت زور شور کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں - اور جس کو اہل ہند کی عزت افزائی نے الہامی کتاب بھی بنادیا ہے - خوب پکار کر کہہ رہی ہے - کہ خدا کی ذات وصفات کے سوا کوئی قدیم نہیں ہے - چنانچہ رگوید منتر ۱ اشلوک ۸ - ادھیائے ورگ ۱۷ اکا جو ترجمہ خود سوامی دیانند جی مہاراج نے بھاشیہ بھومکا صفحہ ۸۵ میں کیا اس کی حرف بحرف نقل یہ ہے :- "جس وقت ذروں سے ملکہ بنی ہوئی دنیا پیدا نہیں ہوئی تھی - اسوقت یعنی پیدائش کائنات سے پہلے اسّت (غیر محسوس حالت) تھی - یعنی شونیہ اکاش بھی نہیں تھا - کیونکہ اس کا اس وقت کچھ کاروبار نہیں تھا - اس وقت ست پرکرتی (یعنی کائنات کی غیر محسوس علت جس کو ست کہتے ہیں وہ بھی نہ تھی - اور نہ پرمانو (ذرے) تھے - وراٹ (کائنات) میں جو اکاش دوسرے درجہ پر آتا ہے وہ بھی نہ تھا - بلکہ اس وقت صرف پر برہم کے سامرتھ (قدرت) جو نہایت لطیف اور اس تمام کائنات سے برتر پرم (بے علت) اکارن ہے - موجود تھی "الخ

کیا رگوید کی اس صریح عبارت میں کوئی تاویل چل سکتی ہے - کیا کسی تاویل کرنے والے کے لفظی الٹ پھیر کچھ کام دے سکتے ہیں -

کیا اسکے بعد بھی ان حضرات کے دو اہم اصول قدامت عالم اور تناسخ کی بیخ و بنیاد قائم رہ سکتی ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ اس قوم کے لیڈروں کی کوشش جو انہوں نے وید کی جدت طرازی میں کی تھی۔ بالکل رائگاں گئی اور انہوں نے خدا کو لوہار، بڑھئی، کمہار کے ساتھ تشبیہ دینے میں فضول اپنا وقت ضائع کیا ان کا خیال ہے۔ کہ جس طرح بڑھئی لوہار ظروف ساز وغیرہ اپنے ہر چیز کے بنانے میں مادہ کی احتیاج رکھتے ہیں۔ اسی طرح خداوند کارساز کیلئے بھی یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ دنیا کے کارخانوں کو بغیر کسی مادہ کے بنا دے۔

لیکن ان صاحبوں کو یہ خیال نہیں رہا کہ بڑھئی، لوہار وغیرہ کو بغیر ہاتھ پاؤں اعضا جسمانی وغیرہ سامان اور اوزاروں کے بھی کسی چیز کا بنانا محال ہے۔ حالانکہ خدا کی نسبت خود بھومکا صہ ۹ میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس کو ان آلات کی ضرورت نہیں۔ بڑھئی، لوہار وغیرہ کو جیسا کہ کسی چیز کے بنانے میں مادہ کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی دیکھنے میں آنکھ کی اور سننے میں کان کی اور بولنے میں زبان کی بھی ضرورت ہے۔ حالانکہ ستیارتھ پرکاش کی تصریح کے موافق خدائے عزوجل بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے۔ بغیر کانوں کے سنتا ہے۔ اور بغیر زبان کے کلام کرتا ہے۔

تو ایسی حالت میں نہ معلوم ان حضرات کو ویدک تعلیم کے برخلاف مادہ قدیم کہنے اور اسپر تناسخ کا خیال باندھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ کیوں صاف طور پر وہی نہ کہدیا جو مسلمان وغیرہ کہتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کے سوا سب اشیاء فانی اور حادث ہیں۔ اور سب چیزوں کا وجود خدائے تعالیٰ کے اعتبار سے ایسا ہی عرضی ومستعار ہے، جیسا کہ زمین وآسمان اور درودیوار کا نور آفتاب کے نور سے یا گرم پانی کی گرمی آگ کی حرارت سے اس خدائے واحد نے اپنی قدرت کاملہ اور ارادۂ نافذہ سے ہر چیز کو نیست سے ہست کر دیا۔ اور وہی اپنے اختیار سے جب چاہے گا نیست کر دیگا۔ نہ اس کی مادہ کی احتیاج ہے۔ نہ اُس پر روح کی حکومت ہے، نہ اُسکے اختیارات محدود ہیں۔ اور نہ اُس کا کوئی فعل حکمت سے خالی ہے۔ وہ تمام کمالات کیساتھ موصوف اور جملہ نقصانات اور عیوب سے پاک ہے۔ کیونکہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں اور وجود ہی ان کا سرچشمہ ہے اور تمام نقصانات عدمی ہیں۔ اور عدم ہی اُن کا باعث ہوا ہے۔ تو جب خدا کا وجود غیر محدود اور اُس کا خانہ زاد ہے۔ کسی دوسری جگہ سے آیا ہوا نہیں اور نہ عدم کا اصلا اس کے ساتھ اختلاط ہوا ہے۔ تو جملہ کمالات بھی اسکے بیحد وبے پایان اور غیر مستعار ہوں گے اور مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے

اندر جو کوئی بھی خوبی اور حسن ہوگا وہ سب اس کے محاسن اور صفات کا پرتو ہوگا۔

پس جب ایسی ذات ستودہ صفات نے اپنے اختیار وقدرت سے دنیا کو بنایا ہے۔ تو یقیناً اُس کی ایجاد اور بقاء میں بے انتہا حکمتیں صرف ہوئی ہونگی۔ اور بے شبہ بنانے سے پہلے ہی خدائے تعالیٰ کے علم میں اُس کا مرتب نقشہ اور ابتدا سے انتہا تک ہر ہر چیز کا اندازہ اور پیمانہ موجود ہوگا۔ جس کو غالباً اہل اسلام لفظ تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ تعبیر اس اعتبار سے بالکل موزون ہے۔ کہ لغت میں اس لفظ کے معنی اندازہ ہی کرنے کے ہیں۔

بہرحال اب تک جو کچھ ہم نے لکھا اس میں اگرچہ اثبات صانع عالم کے متعلق وہ زبردست استدلالات نہیں لکھے گئے۔ جن کی تفصیل ہمارے متکلمین نے اپنی مبسوط تصانیف میں کی ہے۔ یا جن کو ہم انشاءاللہ اسی مفصل کتاب میں درج کریں گے۔ جس کا وعدہ پہلے ہو چکا ہے۔ ہم ایک سچی دلنشین اور عام فہم طریقہ سے جسقدر اس مختصر تحریر میں گنجائش تھی۔ عالم کیواسطے ایک جامع الکمالات فاعل کا ہونا ضروری قرار پاگیا۔ اور یہی وہ مدعا تھا جس کو ہم ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اب جو کچھ گفتگو باقی ہے۔ وہ اس میں ہے کہ اتنی بڑی کائنات کیلئے کیا تنہا ایک

ہی خدا کا وجود کافی ہو سکتا ہے۔ اور اسی سے ہماری سب حاجتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ یا ہم کو مختلف ضروریات کیواسطے در در بھٹکنا پڑے گا۔ اور بہت سے خود مختار بادشاہوں کے سامنے گردن جھکانا ہو گی۔

توحید

یہی وہ بحث ہے جس کے ضمن میں اسلام کے چمکتے ہوئے امتیازات ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس میں آکر تمام مذاہب کے قدم لغزش کھا گئے ہیں۔ اور یہی موقعہ ہے جہاں پہنچکر دین برحق کے کارناموں کی آزمائش ہوتی ہے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس بارہ میں مذہب اسلام کی خصوصیات کو نہایت جلی حرفوں کے اندر ظاہر کریں۔ یہ لازم خیال کرتے ہیں۔ کہ جملہ مذاہب سے علیحدہ ہو کر محض عقلی حیثیت سے اس مسئلہ کو سمجھیں۔ اور خدائے کامل کے دریافت کرنیوالی عقلوں سے دریافت کریں کہ آیا فی الواقع ایک ہی خدا ساری دنیا کا بلا مشقت انتظام کر سکتا ہے۔ یا اس کو اپنی حکومت کے برقرار رکھنے میں کسی یاروں مددگار کی بھی ضرورت ہے۔

جہانتک فکر کی گئی اس سوال کا جواب حکیم الامۃ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح سے زیادہ پر مغز اور جامع کسی نے نہیں دیا۔ اور مصنفین میں غالباً اس قسم کی فلسفیانہ بحث کو اس قدر سلیس زبان میں کوئی نہیں سمجھا

سکا۔ چنانچہ مولانا کے ان مضامین کا ماحصل جو تقریر دلپذیر میں ہے۔
درج ذیل ہے ؎

مطرب از گفتۂ حافظ غزل نغز بخواں — تا بگویم کہ ز عہد طربم یاد آمد

جناب من! دنیا کے پیدا کرنے والے اگر دو یا دو سے زائد خدا ہونگے۔ تو ہرگز کوئی چیز بھی وجود میں نہ آ سکے گی۔ اور یہ سارا قدرتی کارخانہ بالکل درہم برہم ہو جائیگا۔ کیونکہ یہ بات تو یقینی طور پر تسلیم کی جا چکی ہے۔ کہ جس چیز کو خدا کہا جائے اس میں کسی طرح کی کمی اور نقصان نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا ہو کہ عام بندوں میں اور اس میں کوئی فرق نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ بندے خدا بننے سے اس لیے محروم ہیں کہ ان میں قسم قسم کے نقصانات پائے جاتے ہیں۔ اور وجود کی باگ ان کے قبضہ میں نہیں ہے۔ کہ جو خوبی اور جو کمال چاہیں اپنے واسطے موجود کر لیں۔ اب اگر خدا بھی ایسا ہی مجبور ناقص ہو تو اس کو کیا استحقاق ہے۔ کہ وہ ہمارا خدا بن بیٹھے۔ جب یہ بات قرار پا گئی۔ تو اب یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ آدھی مخلوق ایک خدا کی اور آدھی ایک کی ورنہ ہر خدا میں نصفا نصف خدائی کی کمی اور کسر ہوگی۔ اس بنا پر یہی کہنا پڑیگا کہ ہر ایک خدا پوری پوری خدائی کا مالک ہے۔

مگر اس صورت میں جیسا وہ کامل ہوگا۔ دوسرے پر اس کی تاثیر بھی

کامل ہی واقع ہوگی۔ کیونکہ ممکنات اور خالق کی ایسی مثال ہے۔ جیسے آفتاب یا چاند اور زمین و آسمان وغیرہ کی آفتاب سے آفتاب کی طرح کا اور چاند سے چاند کی طرح کا نور پھیلتا ہے۔ اور زمین و آسمان در و دیوار کوہ و اشجار وغیرہ میں سے ہر ایک شے کو حسبِ قابلیت منور کر دیتا ہے۔ اور چیزیں تو فقط نظر ہی آنے لگتی ہیں۔ لیکن آئینے کا اتنے ہی نور سے کچھ اور حال ہو جاتا ہے۔ وہ خود بھی منور ہوتا ہے۔ اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ الغرض جتنا چاند اور سورج میں فرق ہے۔ اتنا ہی اُن کی شعاعوں میں اور اور چیزوں کے منور ہونے میں فرق ہے۔ تو جب خدا کا وجود بڑا ہی کامل ٹھہرا۔ اور مخلوقات کے موجود کرنے میں اس کی تاثیر بھی کامل ہوئی۔ اب اگر ایسے ایسے دو یا کئی خدا ہونگے اور مخلوقات مشترک ہوگی۔ تو ہر طرف سے کامل ہی کامل وجود ہر مخلوق کے پیمانہ اور حوصلہ کے موافق آئیگا۔ گز میں گز بھر اور بالشت میں بالشت بھر اور ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ایک سانچہ میں دو چیزیں اور ایک سیر بھر کے برتن میں دو سیر اناج اور ایک جوتے میں ویسے ویسے دو قدم اور ایک اچکن میں اُس کے موافق دو بدن اور ایک نیام میں اسی مقدار کی دو تلواریں۔ اور ایک مکان میں اسی کی گنجائش کے موافق دو چند اسباب نہیں سما سکتا۔ اور دھینگا دھینگی سے ایک میں دو کو ڈالنے لگتے ہیں۔ تو وہ سانچے اور برتن وغیرہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتے ہیں۔ اسی

طرح اگر دونوں خداؤں کی طرف سے پورا پورا وجود ایک مخلوق میں سمانے لگے تو بیشک وہ مخلوق معدوم اور نیست و نابود ہو جائے گی۔

ہاں اگر خدا کے وجود کا کامل ہونا ثابت نہ ہوتا۔ بلکہ اس میں نقصان اور کمی کا احتمال ہوتا تو یوں بھی کہہ سکتے کہ جیسے دو چراغوں کا نور ملکر کامل نور ہو جاتا ہے دو خدا کے وجود کا پرتو ملکر کمال کو پہنچ جاتا ہوگا۔ مگر اس کو کیا کیجئے۔ کہ خدائی کیواسطے کامل الوجود اور تمام الصفات ہونا لازم ہے۔ اور تمام اہل مذاہب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

اسکے علاوہ ہم کہتے ہیں کہ وہ دو وجود دو خداؤں کی جانب سے مخلوق کو عطا ہوئے۔ اگر ایک ہی خدا کے خزانہ میں ہوتے اور جو زور و قوت اور شوکت و حشمت دوسرے کو حاصل ہے۔ وہ سب بھی اسی ایک خدا کے پاس ہوتے۔ تو بلاشبہ یہ سب ملکر اس ایک تنہا خدا کی انفرادی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر ایک خدا کے وجود میں فی الجملہ کوتاہی اور نقصان ہے۔ جسکی مکافات دوسرے کے وجود سے کی جا سکتی ہے۔ باوجودیکہ اس کا اقرار کیا جا چکا ہے۔ کہ خدائے پاک کی ذات ہر قسم کے قصور و فتور سے مبرا ہے۔ وہ بے نقصان ہے۔ سب چیزیں اس کے بھروسہ پر قائم ہیں۔ وہ کسی کے سہارے کا محتاج نہیں۔ وہ سب کی اصل ہے۔ اور سب اُس کی فرع ہیں۔

اور کیوں نہ ہو جس سلسلہ کو دیکھئے ایک ہی اصل پر قرار پکڑتا ہے۔ نور آفتاب اگرچہ ہزاروں مکانوں اور ہزار ہا روشندانوں میں جدا جلوہ گر ہے۔ لیکن ان سب متفرق انوار کو اسی ایک آفتاب کے ساتھ رابطہ ہے۔ عدد کا سلسلہ گو ایک سے الی غیر النہایہ پھیلا ہوا ہے۔ کہیں دو ہیں کہیں تین کہیں چار۔ کہیں پانچ کہیں بیس کہیں سو کہیں ہزار اور اسپر کہیں جذر کہیں مجذور کہیں حاصل ضرب کہیں مضروب فیہ کہیں حاصل قسمت کہیں مقسوم کہیں مقسوم علیہ وغیرہ لیکن ان سب کی اصل وہی ایک کا عدد ہے۔ اگر ایک نہ ہو تو یہ سارا سلسلہ اعداد کا نیست و نابود ہو جائے۔ موجوں اور حبابوں کے کارخانوں کو دیکھئے تو سب کی اصل وہی ایک عنصر ہے۔ آدمی وغیرہ کو دیکھئے تو سب کے ایک اصل ہیں جسے انسانیت وغیرہ کہتے ہیں مشترک ہیں۔ اسی طرح جہاں نظر پڑتی ہے۔ کوئی ایسا سلسلہ نظر نہیں آتا جس کا کوئی سرمنشا نہ ہو۔ اور پھر ان سرمنشاؤں کو دیکھئے تو ان کا کوئی اور سرمنشا ہے۔ وھلم جرا مثلاً ہم تم۔ ہندو۔ مسلمان۔ یہود۔ و نصاریٰ وغیرہ میں آدمیت سرمنشا ہے۔ اسی طرح گھوڑوں میں کوئی اور سرمنشا ہے۔ اور گدھوں کی اور اصل اور کتوں کی اور اصل ہے۔ ان سب اصولوں کی اصل جاندار ہونا ہے۔ ادھر نباتات کی علیحدہ اصل ہے اور ان کا جدا ہی سلسلہ اور جدا ہی سرمنشا ہے۔ پھر ان کی اصل اور اور جانداروں کی

اصلی تو میت کی زیر حکومت ہے۔ اسی طرح اوپر تک چلے چلو۔ آخر میں جا کر سارے عالم کا اشتراک وجود میں نکلتا ہے۔ لیکن چونکہ شے مشترک عین اشیاء متعددہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یوں سمجھ میں آتا ہے۔ کہ وجود عین عالم اور عین موجودات نہیں (جیسا کہ اپنے موقعہ میں دلائل سے ثابت ہو چکا ہے) بلکہ بایں لحاظ کہ ایک شے کبھی موجود ہو سکتی ہے۔ کبھی معدوم یہ کہا جائے گا۔ کہ وجود عالم ایک خارجی اور عارضی چیز ہے۔ اصلی اور ذاتی نہیں جیسا کہ پانی اپنی ذات سے گرم نہیں ہے۔ اور آگ کی حرارت سے جو کہ اس کی اصلی اور ذاتی صفت ہے۔ اس میں عارضی گرمی پیدا کر سکتے ہیں۔ یا صاف و شفاف آئینہ کا نور جو کہ آفتاب کے مقابل ہو۔ اصلی نہیں۔ بلکہ آفتاب کا فیض ہے۔ جس کا نور اصلی اور ذاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح عالم کے وجود عارضی کے لئے بھی ضرورت ہے۔ کہ وہ کسی ایسے موجود اصلی سے مستعار ہو۔ جس کا وجود عرضی و مستعار نہو۔ پھر جیسے آفتاب سے گو ہزار جگہ دھوپ پھیلے پر سب کی سب ایک ہی آفتاب کا فیض ہے۔ یوں یقین کرنا چاہیئے کہ تمام عالم کا وجود بھی ایک موجود حقیقی و اصلی کا پرتو ہے۔ اسی کو ہم خدا سمجھتے ہیں اور اسی کی نسبت ہمارا یہ خیال ہے کہ اس میں تعدد کی گنجائش نہیں۔

اب یہاں پہنچکر آپ شاید بول اُٹھیں کہ ہم نے مانا کہ موجودات کے وجود میں باہم اسطرح کا فرق نہیں جیسے دھوپ اور چاند کی چاندنی میں

جس کا وجود ایسا ہی یکساں نظر آتا ہے۔ جیسے اس میدان کی دہوپ اور اس میدان کی جس طرح ہر جگہ کی دہوپ کو خواہ وہ میدان وسیع اور جنگل میں ہو یا صحن مکان میں دہوپ ہی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کے وجود کا نام بھی خواہ وہ زمین و آسمان کا ہو یا چاند سورج کا یا انسان و حیوان کا وہی وجود رہتا ہے۔ لیکن اگر فرض کریں کہ آسمان پر ایسے ایسے کئی آفتاب ہوں۔ تو جس طور پر بہت سے ستاروں کا نور ملکر رات کو یکساں نظر آتا ہے۔ بالیقین ان آفتابوں کا نور بھی ملکر یکساں نظر آئیگا۔ پس اگر عالم کے واسطے کئی صانع ہوں اور سب کے وجود کا پرتو ملکر اسی طرح یکساں دکھائی دیتا ہو۔ تو کیا بعید ہے۔

اس شبہ کا جواب اوّل تو وہی ہے۔ جو اس تقریر کے شروع میں معلوم ہو چکا کہ جس کارخانہ کو دیکھئے وہ کسی ایک چیز پر منقطع ہوتا ہے اور جس سلسلہ کو دیکھئے کسی ایک پر منتہی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دہوپوں کا آفتاب پر سلسلہ اعداد کا ایک پر موجوں کے قصہ کا پانی پر تمام ہونا۔ اور چند مثالیں ان کے سوا پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جہاں میں جتنے پھیلاؤ ہیں وہ کسی ایک شئے کی طرف سمٹے چلے جاتے ہیں۔

اب ہم دریافت کرتے ہیں کہ پانی اور آفتاب وغیرہ اشیاء مذکورہ کی وحدت (یعنی ایک ہونے کی صفت) بھی منجملہ موجودات کے ایک شئے

موجود ہے ۔ اور ان اشیاء میں وحدت کا وجود بھی عارضی طور پر ہے ۔ کیونکہ آفتاب اور پانی وغیرہ کے بہت سے ٹکڑے ہو سکتے ہیں اگر ان کی وحدت اصلی اور ذاتی ہوتی تو وہ ان سے کسی طرح زائل نہ ہو سکتی ۔ یعنی اُن میں تقسیم جاری ہوتی اور نہ کثرت کی کسی ہیچ گنجائش نکل سکتی ۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جیسا عالم کا وجود عارضی ہے ۔ وحدت بھی اس کی عارضی ہو گی ۔ اور یہ وحدت بھی اسی موجود اصلی کا فیض ہو گا ۔ جس کا فیض خود وجود عالم ہے ۔ اور اس کی وحدت بھی اسی طرح اصلی ہونی چاہیئے ۔ جس طرح اُس کا وجود اصلی ہے ۔

اس موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسا کہ وحدت اقسام وجود میں سے ہے ۔ ایسی ہی کثرت بھی ہے ۔ اور عالم کا ہر قسم کا وجود عارضی ٹھہرا ۔ اور خدا کے وجود کا پر تو ہوا تو لازم آئے گا ۔ کہ وصف کثرت بھی خدا کے اندر پایا جاوے ۔ اور اس کے واسطے وصف اصلی اور ذاتی ہو ۔ لیکن یہ مغالطہ تمکو اس وجہ سے لگا کہ وحدت کے مانند کثرت کو بھی تم نے اقسام وجود میں شمار کر لیا ۔ حالانکہ کثرت کا مبنی عدم پر ہے ۔

دیکھو ہم جانتے ہیں کہ نور آفتاب ایک شے واحد ہے ۔ لیکن اگر کسی دیوار میں ایک مکان کے دو روشندان برابر برابر ہوں تو درمیان میں اندھیرا ہونیکی وجہ سے ہر روشندان کا نور علیحدہ علیحدہ معلوم ہو گا ۔ غرض یہ کثرت اندھیرے کے سبب سے معلوم ہوتی ہے ۔ اگر اِدھر اُدھر نور اَدر

نیچ میں اندھیرا نہ ہو۔ مثلاً دیوار کو مکان میں سے اٹھا ڈالیں تو سب جگہ نور ہی نور ہو جائے گا۔ اور یہ فرق و امتیاز اور تعدد جس کا نام کثرت ہے۔ ذرا باقی نہ رہے گا۔ اب چونکہ اندھیرا نور کے نہ ہونے کو کہتے ہیں۔ اور نہ ہونا ہی عدم ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کثرت عدم کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ وجود کے اقسام میں سے نہیں۔

بہر کیف اس تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ جو اوصاف وجودی ہیں۔ اور عالم میں پائے جاتے ہیں۔ وہ ضرور ہیں۔ کہ خدائے تعالیٰ میں بھی ہوں۔ اور جو اوصاف عدمی ہیں۔ وہ لازم ہے کہ خدا میں نہ ہوں۔ اور یہ ثابت ہوا کہ جو موجود اصلی ہو گا۔ اس میں کسی قسم کی تقسیم کی گنجایش نہ ہو گی۔ ورنہ وحدت جو اوصاف وجود میں سے ہے۔ جیسا کہ ابھی مذکور ہوا اس میں اصلی نہ رہے گی۔ حالانکہ یہ محال ہے کہ وجود تو اُس کا اصلی ہو۔ اور سب قسم کا وجود مخلوقات کو اس سے پہنچے اور ہر طرح کے وجود کا منبع اور معدن ہو۔ اور پھر اس میں بعض انواع وجود کے اصلی نہ ہوں۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ وجود اس کا عین ذات ہے۔ اور ذات اس کی عین اوصاف ہے۔ اور اوصاف اس کے عین وجود ہیں۔ ورنہ وحدۃ اصلی اور موجودیت ذاتی باقی نہیں رہ سکتی۔

اس وقت گو میں یقین کرتا ہوں کہ جو شبہ تمکو تعدد صانع کے متعلق

پیش آیا تھا اس کا حل کافی حد تک ہو گیا ہے۔ بلکہ اس کے ضمن میں اور بہت سی گراں قدر فوائد بھی اختصار کیساتھ حاصل ہو گئے۔ لیکن میری یہ رائے ہے۔ کہ ابھی اس مضمون کی کچھ اور تشریح کروں۔ اور توحید کے بارے میں جو کچھ بھی شبہات ہوں۔ ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالوں۔ بگوش ہوش سنئے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اگر کم از کم دو صانع ایجاد عالم میں شریک ہونگے تو وہ دونوں جیسا کہ صانع ہونے اور موجود اصلی ہونے میں شریک ہونگے۔ ایسے ہی کسی نہ کسی امر میں علیحدہ بھی ہوں گے۔ کیونکہ جہاں اشتراک کیساتھ تعدد پایا جائے تو وہاں لازمی بات ہے۔ کہ کسی حیثیت سے ایک کو دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز بھی سمجھا جائے۔ مثلاً دو آدمی باوجودیکہ آدمیت میں شریک ہیں۔ مگر بعض اوصاف میں مختلف بھی ہیں جیسا کہ شکل و صورت، قد و قامت، مکان و زمان، رنگ و روپ خاصیت مزاج وغیرہ میں اگر یہ علیحدگی اور فرق نہ ہو تو تعدد ہرگز نہ ہو۔ دو ہی ایک آدمی رہے اس وجہ سے ضروری قرار پایا کہ جو دو چیزیں کسی امر میں مشترک ہوں۔ تو ان میں سے ہر ایک کے اندر ایسے خصوصیات ہونی چاہئیں۔ جو دوسری میں نہ پائے جائیں۔ ان ہی خصوصیات کے مجموعہ کو ہم اپنی اصطلاح میں ذات سے تعبیر کرتے ہیں۔

مگر ذات بے وجود کے معدوم محض ہے۔ کیونکہ دنیا کی ہر ایک چیز وجود

کے ذریعہ سے ہی موجود کہلاتی ہے۔ البتہ خود وجود کو اپنے موجود ہونے میں کسی دوسرے وجود کی حاجت نہیں اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ ہر شے کو اپنے روشن ہونے میں نور کی حاجت ہے۔ مگر خود نور کو اپنے نورانیت میں دوسرے نور کی حاجت نہیں۔ اب اگر دو یا کئی صانع ہوں اور وہ دونوں وجود میں اشتراک رکھتے ہیں۔ تو اُن دونوں کی ذات (یعنی وہ خصوصیات خاصہ جن سے ایک دوسرے سے امتیاز حاصل ہے) وجود کے ماسوا کوئی اور چیز ہوگی اور چونکہ وجود کے سوا سب چیزیں اصل سے معدوم ہیں۔ اسلئے ہر ایک خدا فی حد ذاتہ وجود سے بالکل خالی ہوگا۔ اور اُن پر وجود اسی طرح عارض ہوگا۔ جس طرح زمین و آسمان وغیرہ سب چیزیں جو فی نفسہ تاریک اور مظلم تھیں۔ مگر آفتاب کے نور نے ان سب کو روشن کر دیا۔ اس صورت میں ہم دونوں خداؤں کو کسی طرح موجود اصلی نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ دونوں بھی کسی ایسے موجود اصلی کے محتاج ہونگے۔ جس کا وجود خود اس کی ذات کے اندر داخل ہو۔ اور ہمارا مقصد بھی توحید سے صرف اتنا ہی تھا۔ کہ موجودات کا سلسلہ ایک موجود اصلی پر ختم ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ بات اس تقریر سے بخوبی حاصل ہوگئی۔

کیونکہ جب موجودات دو خداؤں سے مثلاً پیدا ہوئے اور وہ

دونوں ایک موجود اصلی میں شریک اور اصلی سے معدوم ٹھہرے تو یہ معنی ہوئے کہ موجود اصلی کا فیض ان دونوں کے واسطے سے اوروں کو پہنچتا ہے۔ جیسے پرنالہ کے وسیلے سے چھت کا پانی نیچے آتا ہے۔ اور آتشی شیشہ کے طفیل سے آفتاب کی سوزش دوسری چیزوں کو پہنچتی ہے۔ اور قلعی دار آئینہ کے صدقے سے آفتاب کا نور ان درو دیوار کو پہنچتا ہے۔ جو آفتاب کے مقابل نہیں ہوتے۔ ان تمام صورتوں میں سب کو معلوم ہے کہ چھت کا پانی پرنالہ کی راہ سے آتا ہے پرنالہ سے پیدا نہیں ہوتا۔ آفتاب کی سوزش آتشی شیشہ کی راہ سے آتی ہے آتشی شیشہ میں کچھ حرارت نہیں۔ آفتاب کا نور آئینہ کی راہ سے اور اشیاء کو پہنچتا ہے۔ آئینہ میں ذرا برابر نور نہیں تو اسی طرح اگر بہت سے موجود اصلی اور بکثرت صانع موجود ہوں۔ تو توحید میں کچھ رخنہ نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ اور یہ زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے۔

کیونکہ فلک اور زمانہ جو باعتبار شہرت کے وقائع عالم کا فاعل گنا جاتا ہے۔ یا انسان و حیوان وغیرہ جو ظاہر بینوں کو افعال اختیاریہ کے خالق معلوم ہوتے ہیں۔ یا دوا اور دعا وغیرہ جو بہ نسبت اپنی تاثیروں کے موثر حقیقی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اس وقت بحیثیت اپنے فیوض کے وسیلہ فیض اور واسطۂ ایجاد سمجھی جائے گی۔ اور ان کے خالق ہونے کا شبہ جو بعض ظاہر پرستوں کو پڑا ہوا ہے۔ بے محنت

حل ہو جائیگا - اور اُس وقت ہم بآواز دہل یہ ندا دے سکیں گے کہ ماسوا خالق بزرگ کے جو چیزیں ظاہر میں مصدر افعال یا مصدر تاثیرات نظر پڑتی ہیں - وہ سب خدائے اکبر کے سامنے ایک کاریگر کے آلات کی طرح ہیں - بادی النظر میں ان چیزوں سے کام ہوتا ہے - اور حقیقت میں خدا کرتا ہے - اعلیٰ طبقہ کے حضرات جیسے نبی ہوں یا ولی اور ادنے درجہ کے مثلاً دیو ہوں یا پری اور آوارہ ہوں - یا فلک دوار - دوا ہو یا دعا، پتھر ہو یا کوئی جاندار چیز، زمانہ ہو یا مکان، چاند ہو، یا سورج ستارے ہوں یا اور کچھ سب خدا کے سامنے ایسے ہیں - جیسے بڑھئی کے سامنے بسولہ کلہاڑی برما وغیرہ فرمانبردار ہوتے ہیں - کہ بے ہلائے اُس کے نہیں ہلتے اور بغیر اُس کی مرضی کے کوئی کام نہیں کر سکتے -

اور اس سارے سلسلہ عالم کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مشینوں اور کلوں کے کارخانوں اور گھڑیوں وغیرہ میں بہت سی کلیں اور پرزے آگے پیچھے ہوتے ہیں - پھر اگر کوئی کام لینا منظور ہوتا ہے - اوّل کل کو ہلاتے ہیں اور سب کلیں بہ ترتیب ہلتی ہیں اور آخر میں جو کام مقصود ہوتا ہے وہ اخیر کی کل سے ہوتا ہے - ظاہر ہے کہ کلیں خود بخود نہیں ہلتیں کیونکہ وہ جس وحرکت جمادات میں ہیں انکے واسطے جب تک کوئی ذی عقل اور صاحب ارادہ کام لینے والا نہ ہو گا ہرگز کام نہ چلیگا اسی طرح سلسلہ عالم کے واسطے علت العلل اور فاعل حقیقی ایک خدائے تعالیٰ ہے کوئی ادنی سے ادنے فعل اور خفیہ سے

حقیر چیز بھی اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی اور کسی شے کو اس کی سطوت اور حکومت کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں جو کچھ وہ چاہے اس میں کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا اور مقرب سے مقرب بندے بھی اس کے دربار میں بغیر اس کی اجازت کے لب نہیں ہلا سکتے۔ یہی وہ عقیدہ ہے۔ جس کی طرف اسلام نے نہایت زور شور کے ساتھ دعوت دی ہے۔ یہی خیال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا سنگ بنیاد ہے۔ اور اسی مضمون کی اشاعت تمام انبیا کی بعثت کا مقصد اولین ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب میں توحید کی فی الجملہ جھلک پائی جاتی ہے۔ اور جن مذاہب میں شرک صریح کی تعلیم موجود ہے۔ وہ بھی توحید کے بالکلیہ ترک کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔ بلکہ توحید کے چھوڑنے سے یہ بہتر سمجھتے ہیں۔ کہ شرک کو توحید کیساتھ جمع کر لیا جاوے اگرچہ یہ اجتماع اجتماع نقیضین ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ عزت خاص مذہب اسلام کو حاصل ہے۔ کہ اُس نے بالکل خالص اور بے لوث توحید کیطرف لوگوں کو رجوع کیا اور شرک جلی یا خفی کا تسمہ باقی لگا نہیں رکھا۔ اس جہالت اور تاریکی کے زمانہ میں جبکہ دنیا میں خالص توحید سے بڑھکر کوئی گناہ نہ تھا۔ ہزاروں بندگان خدا کو توحید سے مانوس بنا دیا۔

اور آجتک کروڑہا کروڑ انسانوں کے دلوں سے شرک فی الذات، شرک فی الصفات اور شرک فی العبادۃ کی ظلمتوں اور کدورتوں کو دہو ڈالا۔

کیا اسلام کی اس بے غل وغش توحید کا مقابلہ اس قوم کی توحید کر سکتی ہے۔ جس نے خدا کے سوا ہر اینٹ پتھر کے سامنے گردن ڈالدی اور آگ، پانی وغیرہ کو بھی قابل پرستش سمجھا اور اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مورتوں کو حاجت روا اور مشکل کشا تصور کر لیا۔ یا اس قوم کی جن کے خدا کی تکمیل مادہ اور روح سے ہوتی ہے۔ ان کا کمزور خدا ان دونوں کے منشار کے خلاف نہ کبھی کوئی کارروائی کر سکتا ہے اور نہ ان سے بگاڑ کر ایک قدم اپنی خدائی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ یا اس قوم کی جن کا مثلث خدا اپنی کرسی عظمت سے اتر کر تمام انسانی حوائج اور بشری خصوصیات کا محکوم بنا اور بنی آدم کی خطائیں معاف کرنے کے واسطے اس کو سخت تکالیف اور مشقتیں برداشت کرنا پڑیں۔ یا اس قوم کی جن کا خدا خلقت کے بے سوچے سمجھے پیدا کرنے پر سخت نادم ہوا اور دنیا میں طوفان آجانے سے اسے بیحد ملول ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ روتے روتے اُن کی آنکھیں سوج گئیں۔ اور ملائکہ کو اس کی عیادت کرنی پڑی اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے جب اُس کی کشتی ہوئی۔ تو انہوں نے اس کو زمین پہ ٹپک دیا۔

کیوں منصفو! کیا ایمان سے کہہ سکتے ہو کہ آج صحیح اور مکمل توحید ان میں سے کسی مذہب کی بدولت دُنیا میں نظر آ رہی ہے۔

نبوّت

ان تمام مراحل کے بعد جو ہم نے یہانتک طے کئے ہیں۔ سب سے زیادہ ضروری اور معرکتہ الآرا بحث جو باقی رہ جاتی ہے وہ نبوت کی بحث ہے۔ اور افسوس کہ جس قدر وقت اس بحث کیلئے درکار ہے اس کا عشر عشیر بھی ہمارے پاس موجود نہیں۔ لیکن اس پر بھی ہم نے یہ کسی حال میں مناسب نہیں سمجھا کہ اسلام کے اتنے بڑے رکن اعظم کو بالکلیہ قلم انداز کر دیا جاوے۔ ہاں یہ ممکن ہے۔ کہ یہاں پر ایک اجمالی بحث اس کے متعلق لکھکر تفصیل تام کو اسی ضخیم کتاب کے اوپر اٹھا رکھیں۔ جس کی اُمید ہم پہلے دلا چکے ہیں۔ تاکہ ہمارے قارئین کے دلوں میں اگر کوئی گھبراہٹ اور تشویش پیدا ہو تو وہ اس سے اپنی تسکین کر لیں۔

نبوّت کا عقدہ حل ہونے سے پہلے ہر انسان پر یہ فرض ہے۔ کہ وہ اسباب اطاعت پر غور کرے۔ یعنی یہ کہ ایک آدمی کی اطاعت دوسرے پر عقلاً کون حالتوں میں اور کن وجوہات سے ضروری سمجھی جاتی ہے اس بارے میں جہانتک تامل سے کام لیا گیا۔ کل تین سبب اس کے متعین ہوئے

جلبِ منفعت - دفعِ مضرت اور عشق و محبت چنانچہ نوکر اپنے آقا کی اطاعت ملازمت کی اُمید پر اور رعیت اپنے حاکم کے اندیشہ تکالیف سے اور عاشق اپنے محبوب کے بتقاضائے محبت کرتا ہے - اور اطاعت کی کوئی ایک فرد بھی ایسی نظر نہیں آتی جو ان تینوں وجوہات سے خالی ہو -

اب اگر یہ تینوں سبب فرض کرو - کسی ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں تو فطرت انسانی یقیناً اس کی خدمت و اطاعت کو فرض عین قرار دے گی - پس جبکہ پچھلے اوراق میں حق تعالےٰ شانہٗ کی نسبت مدلل طریقہ سے یہ طے ہو چکا ہے - کہ دنیا کے تمام کام اسی کے ارادہ اور اختیار سے انجام پاتے ہیں - اور ہر قسم کی داد و ستد سلب و عطا اور نفع و ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے - اور ہر قسم کا کمال اور حسن و خوبی اُسی کی ذات اقدس میں موجود ہے - اور اس کے سوا کوئی عالم کا مربی اور محسن بھی نہیں ہے تو بے شبہ عقل کے نزدیک ایسے خدا کی عبادت سے سرمو انحراف جائز نہ ہوگا - تو یہ لازم ہوگا - کہ اُسی کی خدمت گزاری میں آدمی مصروف رہے - اسی کا ہر دم دھیان رکھے اور اسی کی محبت میں اپنے کو دیوانہ بنائے - جئے تو اسی کے نام پہ جئے اور مرے تو اسی کا کلمہ پڑھتا مرے - غرض کسی حالت میں اس سے جدا نہ ہووے - اور ظاہر و باطن میں اسی کا تابع فرمان رہے :۔

باطن کی فرمانبرداری تو یہی ہے کہ دل میں خدا تعالٰے کے متعلق یہ یقین ہو کہ ہماری ہستی اس کی ہستی کے سامنے بالکل حقیر اور اس کا وجود ہر طرح پر عظمت اور کامل اور مکمل ہے۔ ہماری ہر قسم کے نفع و نقصان کا اختیار اسی کو ہے۔ اور وہ ہمارا حاکم۔ ہم محکوم ہیں۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی شان محبوبیت موجود ہے۔ اور ظاہری فرمانبرداری وہ افعال و حرکات ہیں جن سے ہمارے انہیں اندرونی جذبات اور باطنی اعتقادات کا سراغ ملتا ہو۔ اور خدا کی محبوبیت کا خیال اُن سے مترشح ہوتا ہو۔

مثلاً خدائے تعالٰی کے سامنے اُس کی خاص تجلی گاہ کی طرف ہاتھ باندھکر کھڑا ہونا اس سے اپنے حال کے متعلق عرض معروض کرنا اور ہر ہے حکم آجانے پر سر نیاز جھکا دینا اور اس کے آستانہ پر اپنے کو ذلیل و حقیر سمجھکر ناک اور پیشانی رگڑنا یہ سب آثار محکومیت اور آداب شاہی کے قائم مقام ہیں۔ علی ہذا القیاس اپنے مال و دولت کو خدا کے بتلائے ہوئے مصارف میں خرچ کرنا اور ہر آمد و صرف میں اس کے حکم کا منتظر رہنا یہ بھی سراپا اطاعت ہونے کے لوازمات میں سے ہے۔

پھر اگر خدائے تعالٰی کو محبوب حقیقی سمجھتا ہے تو اُس کے قرب

وصل کی فکر میں ہر ایک ماسواء سے بیزار ہو جانا آب و طعام اور لذت جماع کو (جو کہ خلاصہ تمام کائنات کا ہے) ترک کر دینا۔ اس کے بعد تجلی گاہ ربانی کی طرف پا برہنہ سر برہنہ لبیک کہتے ہوئے دوڑنا اور وہاں پہنچکر کبھی حالت شوق و وجد میں اس تجلی گاہ کے گرد گھومنا۔ کبھی جنگلوں میں بھٹکتے پھرنا۔ کبھی دشمن محبوب کے خاص مکان پر سنگ باری کرنا اور کبھی جان و مال سے فدا ہونے کیلئے طیار رہنا۔ یہ سب محبت قلبی کی علامات اور عشق حقیقی کے ظاہری نشانات ہونگے۔

الغرض یہ امر تو اب عقلاً پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ دل سے زبان سے ہاتھ پاؤں سے جس طرح بھی بن پڑے آدمی اپنے خالق کی اطاعت کی طرف متوجہ رہے۔ اور ہرگز اپنا روئے نیاز دوسری جانب نہ پھیرے۔ لیکن سخت مشکل یہ تھی۔ کہ کسی کی اطاعت بغیر اس کے متصور نہیں کہ ہمکو اس کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں کا علم ہو اور خدائے تعالیٰ کی نسبت یہ دریافت کرنا کہ وہ کن امور سے خوش اور کن امور سے ناخوش ہوتا ہے۔ ہر شخص کی قدرت سے باہر تھا۔ کیونکہ محض اپنی عقل سے اگر ہم نے چند احکام معلوم کر لئے تو اول تو تمام احکام کی تفصیل اس سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ خدائے تعالیٰ شانہٗ ہماری عقل کا ہر بات میں پابند بھی نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر خدائے تعالیٰ

کی اطاعت و عبادت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ خود خدائے برتر اپنی رضا و عدم رضا سے بندوں کو مطلع فرمائے۔

اور یہ خوب معلوم ہے کہ جب سلاطین دنیا اس تھوڑی سی نخوت و تکبر اور ذرا سے چھوٹے استغنا پر یہ ہر دوکان، دوکان اور مکان، مکان اپنے احکام سناتے نہیں پھرتے اور نہ انکو یہ گوارا ہے کہ ہر کس وناکس کو اپنے مافی الضمیر کی اطلاع کے واسطے ہمکلامی بخشیں تو کیا وہ احکم الحاکمین وراء الوراء ثم وراء الوراء جسکو تمام عالم سے بالکل استغنا اور سب چیزوں کو اس کی احتیاج ہے۔ ہر ایک عام وخاص اور ہر ایک رند و بازاری کو منہ لگانا اور اپنی حضوری و ہمکلامی سے باریاب فرمانا پسند فرمائے گا۔ جب ایسا نہیں تو بیشک خدا کے یہاں بھی کچھ لوگ ایسے خاص ہونگے جیسے بادشاہوں کے یہاں وزیر یا نائب السلطنۃ یا وائسرائے اور جیسا کہ تمام سرکاری احکام رعایا کے پاس انہیں صاحبوں کے توسط سے پہنچتے ہیں۔ ایسے ہی خدا کے پیام اور اوامر و نواہی ان معتمدین کے ذریعہ سے ہم تک موصول ہونگے۔ ہم انہیں معتمدین کو انبیاء، رسول اور پیغمبر کہتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے کہ جس زمانہ میں خدائے تعالیٰ سمجھتا ہے۔ ایسے رسولوں کو اس زمانہ کے مناسب ہدایات دیکر مبعوث فرمادیتا ہے۔

یہاں پر تم کو شاید یہ شبہ گذرے کہ مختلف قرون میں جب انبیاء علیہم السلام تشریف لاوینگے اور ظاہر ہے کہ ان میں سے مؤخر کی شریعت مقدم کی شریعت کے واسطے ناسخ ہو گی تو وہم یہ ہوتا ہے۔ کہ پہلے نبی کے بھیجنے میں شاید خدائے تعالیٰ سے کچھ سہو ہو گیا تھا۔ یا بھول چوک سے اُس کو مناسب احکام دیئے تھے۔ جو دوسرے نبی کے ذریعہ سے اس غلطی کی اصلاح کرائی گئی۔ مگر یہ شبہ آپ کا سراسر کم فہمی اور نادانی پر مبنی ہے۔ نسخ کے معنی صرف تبدیل احکام کے ہیں۔ یہ آگے آپ کا قیاس ہے۔ کہ وہ تبدیلی پہلی غلطی کی اصلاح کی وجہ سے واقع ہوئی ہو گی۔ خدائے برتر کی نسبت ایسا خیال باندھنا سخت گستاخی ہے۔

آپ نے بارہا دیکھا ہو گا کہ طبیب اگر کسی مریض کو مسہل دینا چاہتا ہے تو اس کے لئے پہلے منضج کا نسخہ تجویز کرتا ہے۔ چند روز بعد وہ نسخہ بدل کر مسہل کا نسخہ پلاتا ہے۔ تو کیا آپ نے اس طبیب کی نسبت بھی یہی رائے قائم کی ہے۔ کہ اس سے منضج کا نسخہ دینے میں غلطی ہو گئی تھی۔ جسکی مکافات وہ دوسرے نسخہ سے کر رہا ہے۔ جب یہاں آپ نے ایسا نہیں سمجھا۔ تو خدا تعالیٰ کے معاملہ میں آپ کو کس چیز نے مجبور کیا ہے۔ کہ باوجہ ایک ایسا مہمل خیال پیدا کر لیں۔ کیوں یہ نہیں مان لیتے کہ اس نے بھی ہر زمانہ کی طبیعت اور مزاج کا اندازہ کر کے اس کے موافق مختلف احکام جاری کر دیئے ہیں

اور اُس میں کچھ مضائقہ نہیں رہا باقی یہ غلجان کہ کیا خدائے برتر اس پر قادر نہ تھا۔ کہ ابتدائے عالم میں ہی کوئی ایسی مکمل کتاب ہدایت کیلئے نازل فرما دیتا جس میں ہر زمانہ کے تغیرات کی رعایت کر لی جاتی اور اس کی حاجت نہ رہتی کہ بار بار وہ اپنے سچے الہام میں دست اندازی کرے۔ اس کی بابت میں عرض کرتا ہوں۔ کہ بیشک خدا اگر اس پر قادر تھا۔ تو کیا اس پر قادر نہ تھا۔ کہ بغیر نطفہ اور خون بننے۔ رحم مادر میں پرورش پانے اور بتدریج نشو و نما کرنے کے ایک کامل و مکمل انسان دفعتہً پیدا کر دیتا (جیسا کہ آریہ سماج اپنے چار رشیوں کی نسبت کہتے ہیں) یا بغیر تخم ریزی اور آبپاشی وغیرہ سامان زراعت کے خود بخود تمام نباتات کو زمین سے اُگا دیتا ہے۔ اگر اس نے باوجود قدرت کے جسمانیات میں (نعوذ باللہ) یہ دردسری اُٹھائی تو روحانیات میں بھی اُس کو اپنی اسی عادت سے معذور سمجھنا چاہیئے۔ اور اگر وہاں اس تدریجی ترقی میں کچھ خاص حکمتیں اور مصلحتیں متعلق ہو سکتی ہیں۔ تو یہاں اسی قسم کی مصلحتوں کا لحاظ کرنے سے کون چیز مانع ہے۔

بہرکیف اس میں کچھ حرج نہیں۔ بلکہ عین حکمت اور رحمت ہے۔ کہ حق تعالیٰ سبحانہ ان مختلف تخم ہائے اخلاق کے (جو ازل سے قلوب بنی آدم کی زمینوں میں ڈال دیئے گئے ہیں) تربیت اور نشو و نما کیواسطے اپنی رحمت کے بادل بھیجے اور بادلوں کے برسنے سے جس زمین میں جیسا کچھ

اچھا یا بُرا بیج بویا گیا ہے - اس کو ترقی اور نشو و نما حاصل ہو - وہ ابر ہائے رحمت جیسا کہ بلالؓ اور سلمانؓ کے کھیتوں کو سرسبز و شاداب کریں - ایسے ابوجہل وغیرہ کے دلوں میں جو کفر و شقاوت کا بیج بکھیر اگیا ہے - اُس میں بھی جان تازہ ڈالدیں - ان ہی سحابہائے معارف کو انبیاء کہا جاتا ہے - اُن کے اثر کو تقویت پہنچانے والوں کا نام ملائکہ ہے - اور انکی تدابیر کی رہزنی کرنے والوں کو شیاطین کا لقب دیا جاتا ہے -

ملائکہ اور شیاطین

ملائکہ اور شیاطین کا لفظ سُنکر بعض منکرین کو شاید ہم پر غصہ آجائے اور وہ اس تصور پر کہ ہم نے ان کے نزدیک چند فرضی چیزوں کا نام لے دیا ہے - کہیں ہمارے تمام سابق بیانات کو واقعیت سے دور نہ سمجھ بیٹھیں - اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے - کہ ان دونوں لفظوں کی بھی کچھ مختصر تشریح کر دی جائے -

یہ خوب یاد رہے کہ باجماع اہل عقل جسم انسان کی ترکیب چند ایسے مختلف عنصروں سے دی گئی ہے - جن میں سے ایک عنصر کی تاثیر دوسرے کے مخالف اور متضاد ہے - مثلاً بدن انسان میں گرمی کے آثار پائے جاتے ہے یہ معلوم ہوتا ہے - کہ اس کے قوام میں کوئی حصہ آگ کا موجود ہے - اور سردی

کی کیفیات محسوس ہونے سے جزو ہوائی کا تیقن ہوتا ہے۔ اور خشکی سے جزو خاکی کا ثبوت اور تری سے جزو آبی کا پتہ چلتا ہے۔ گویا کہ مٹی۔ پانی۔ ہوا اور آگ میں سے ہر ایک کا بقدر مناسب حصہ لیکر جسم کا خمیر بنایا گیا ہے۔
اس کے بعد جب حکماء نے دیکھا کہ جو آدمی پیدا ہوتا ہے۔ اس میں چاروں اجزاء ضرور ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے ایسے چار خزانوں کا کھوج لگایا۔ جن میں یہ چاروں چیزیں الگ الگ بافراط موجود ہوں۔ اور جن میں سے تھوڑا تھوڑا لیکر خدائے تعالیٰ نے آدم کے جسم کو ترکیب دیا ہو۔ اس قسم کے چار خزانوں کے نام انہوں نے کرۂ ارض، کرۂ ہوا، کرۂ نار تجویز کیا ہے اور ان میں سے ایک ایک کو حرارت، برودت۔ رطوبت۔ یبوست کا منبع اور معدن قرار دیا۔
ٹھیک اسی طرح روح انسان کی ترکیب اور اُس کا امتزاج ایسے دو متضاد اور معارض اجزاء سے واقع ہوا ہے۔ جسکی بنا پر انسان کبھی نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور کبھی بدی کی طرف اُس کی رغبت ہوتی ہے۔ کیونکہ جس طرح کسی نے خدائے تعالیٰ کو آدم کا خمیر بناتے نہیں دیکھا۔ بلکہ صرف یہ سمجھ کر کہ رطوبت اور یبوست مثلاً دو متضاد اثر ایک ہی چیز سے پیدا نہیں ہوتے۔ یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ یقیناً جسم کی ترکیب آب و خاک وغیرہ سے ہوئی ہے۔ اسی طرح طاعت و معصیت کی طرف میلان جو ایک ہی آدمی

سے متفرق اوقات میں مشاہدہ کیا جاتا ہے - اس کے بغیر جوڑ نہیں کھاتا - کہ روح کی ترکیب بھی دو مختلف قسم کی اشیاء سے مانی جاوے -

اور جب یہ ہے تو جیسا کہ عناصر جسم کے لئے علیحدہ علیحدہ چار مخزن تسلیم کر لئے گئے تھے - ایسا ہی ان دونوں روحانی جزوں کے واسطے بھی مخلوقات میں دو مخزن مان لئے جاویں تو کیا استبعاد ہے - پس خدا کی وہ مخلوق جس میں ہمیشہ امور خیر اور نیکی ہی کی طرف توجہ پائی جاوے - اور ان کا طبعی اقتضاء طاعت ہی ہو - اور ان کی صرف یہی شان ہو کہ لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون اسی مخلوق کو ہم ملائکہ اور فرشتوں سے تعبیر کرتے ہیں - اور اُن کے مقابلہ میں وہ گروہ جس کی طبیعت میں معصیت ہی معصیت رکھی ہو - اور طاعت و عبادت سے اس کا پیمانہ بالکل خالی ہو اور اس کی حالت محض وکان الشیطان لربہ کفورا ہی سے ادا کی جا سکتی ہو - ایسے گروہ کو ہم شیاطین کا لقب دیتے ہیں - اس پر بھی اگر ہم سے کوئی مہربان آریہ دریافت کریں - کہ گو عقلی دلائل سے ایسی چیزوں کا وجود ثابت ہو سکتا ہے - مگر ہم نے اور کسی نے آجتک اُن کو نہیں دیکھا اور رجماً بالغیب ایمان لانیکو ہمارا دل گوارا نہیں کرتا تو ہم ان حضرات کی خدمت میں بادب گذارش کرینگے - کہ آپ نے وہ تین حصہ بذات خود روشن دنیا کے جو ہماری دنیا سے بالکل علیحدہ ہیں - اور جن کا ذکر بحر دید

کے تیسرے منتر میں موجود ہے۔ کب اور کس وقت اور کس جگہ مشاہدہ کئے ہیں اور اگر کئے ہیں تو کیا آپ دوسرے لوگوں کو ان کا مشاہدہ کرانے کے لئے تیار ہیں۔ دیکھئے اب آپ خود اس منتر کا ترجمہ بھاشیہ بھومکا صفحہ ۸۱ میں ملاحظہ فرمائیے۔ کہ "گذشتہ و آئندہ موجودہ جس قدر کائنات ہے اس سب کو اسی پرش کے مہما یعنی عظمت کا نشان سمجھنا چاہیئے"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ محدود کائنات کو اس کی عظمت کا نشان بنانے سے اس کی عظمت محدود ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب اسی منتر میں آگے دیتے ہیں۔ کہ اس کی عظمت اسپر محدود نہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اور غیر محدود ہے۔ پرکرتی سے لیکر زمین تک تمام (لطیف و کثیف) کائنات اس غیر متناہی قدرت والے ایشور کے ایک پہلو میں قائم ہے۔ اُسی کی ذات پر نور میں امرت (عالم عرفانی یا موکش کا سکھ) موجود ہے۔ یعنی تین حصہ کائنات عالم لطیف و روشن میں موجود ہے۔ گویا غیر روشن دنیا ایک حصہ ہے۔ اور بذات خود روشن دنیا اس سے تگنی ہے۔ اور وہ ایشور عین راحت موکش سوروپ حاکم کل معبود کل عین مسرت اور سب کو روشن و منور کرنیوالا ہے" اس عبادت کے سننے کے بعد بھی کیا ہندوستان کی پرجوش سوسائٹی کا کوئی ممبر جن و ملک یا بہشت و دوزخ کے وجود سے انکار کر سکے گا ۔

نبی کی علامات

منکرین کے شبہات کا حل کرنے میں چونکہ اب ہم اپنے اصلی مقصد سے دور نکل گئے ہیں۔ اس لئے ہم کو اسی طرف پھر عود کرنا چاہیئے۔ اور یہ بتلانا چاہیئے کہ کسی شخص کو رسول برحق ماننا کن شرائط پر موقوف ہے آیا جو کوئی بھی دعویٰ نبوت زبان سے کرنے لگے یا جو کوئی بھی دنیا کو چند عجیب وغریب تماشے دکھلا دے یا جو کوئی بھی دو چار ہزار مرید جمع کر لے اسی کو ہم نبی اور پیغمبر مان لیں یا نبوت کیواسطے کوئی معیار ایسا تجویز کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعہ سے ماہر طبیبوں کو اشتہاری حکیموں سے جدا کیا جا سکے۔ رہبر اور رہزن کے پہچاننے میں دھوکہ نہ لگے۔ اور محافظوں کی جماعت پر لٹیروں کا اشتباہ نہ ہو۔

بلاشبہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جبکہ انبیاء علیہم السلام خدا کے معتمد اسکے وکیل اس کے رازدار اور اس کے نائب ہیں۔ تو اُن کی ذات میں ایسے پاکیزہ اوصاف اور حقیقی خوبیاں مجتمع ہونی چاہئیں۔ جو ایک ایسے باخبر شہنشاہ اعظم کا قرب حاصل کرنے کے لئے درکار ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سلاطین دنیا بھی جن کو کچھ عقل ہو۔ باوجود اس مجازی حکومت کے اپنی مسند قرب پر ان لوگوں کو نہیں بٹھلاتے جو بے عقل، کج خلق، پست حوصلہ

یا حکومت کے دشمن ہوں۔ چہ جائیکہ خدائے برتر اپنے منصب وزارت کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کرے۔ جن کی اخلاقی حالت نہایت پست، عملی حیثیت نہایت ذلیل اور عقلی قوتیں نہایت کمزور ہوں۔ وہ بجائے ہدایت پھیلانے کے گمراہ کرنے میں زیادہ مشتاق ہوں۔ اور لوگوں سے بمقابلہ خدا کی عبادت کرانے کے اپنی پرستش کے زیادہ متمنی ہوں۔ اگر نعوذ باللہ خدائے عزوجل ایسا کرے تو یوں کہو کہ وہ خدا بالکل سفیہ اور جاہل یا بندوں سے عداوت رکھنے والا ہے۔ جس کو اتنی بھی خبر نہیں ہے کہ میں جس شخص سے جو کام لینا چاہتا ہوں۔ وہ اُس کی اہلیت نہیں رکھتا۔

تو اس صورت میں یہ واجب ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں اولاً تو خدا کی محبت اور اخلاص اس درجہ ہو کہ ارادہ معصیت کی گنجائش ہی نہ نکلے۔ دوسرے یہ کہ اخلاق پسندیدہ جو اعمال حسنہ کی جڑ ہیں۔ انکے اندر فطرتی طور پر راسخ ہوں۔ تاکہ جو کام بھی وہ کریں۔ قابل اقتدا اور جو فعل بھی ان سے سرزد ہو باعث ہدایت سمجھا جائے۔ تیسرے یہ کہ فہم و فراست ان انتہیوں کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہو کیونکہ کم فہمی فی نفسہ عیب ہونیکے علاوہ اسوجہ سے بھی انکے حق میں مضر ہے کہ کلام خداوندی کے اسرار غامضہ کا سمجھنا اور دقیق علل پر مطلع ہونا اور ہر ایک ذکی و غبی کو احکام الٰہی دلنشین طریقے سے سمجھا دینا بغیر عقل صحیح اور فہم کامل کے ہرگز متصور ہی نہیں۔

یہی تین اصول ہیں جو ایک مدعی نبوت کی صداقت کا ہمکو ایک ایسے زمانہ میں پتہ دے سکتے ہیں جس میں کسی نبی کی بعثت کا احتمال ہو سکتا ہو۔ باقی معجزات وہ اگرچہ اصل نبوت کے اعتبار سے ضروری نہیں۔ لیکن مدعی نبوت سے ان کا صادر ہونا بیشک اس کی راست بازی کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص مثلاً سلطان روم کے روبرو لوگوں سے یہ کہے کہ میں سلطان کا معتمد اور محبوب ہوں۔ اور اس کی دلیل یہ بیان کرے کہ دیکھو جسطرح میں اُن سے کہونگا۔ برابر وہ اسی کے موافق کرینگے اور جو فرمائش کرونگا اس کو پورا کر کے دکھلائیں گے۔ یہ کہکر سلطان کو کھڑا ہونے کی طرف اشارہ کرے اور وہ کھڑے ہو جائیں۔ پھر ان سے بیٹھنے کو کہے اور وہ معاً بیٹھ جائیں اور اسی طرح لگاتار بہت سے کاموں کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ بھی ایک ذرہ اُس کا خلاف نہ کریں۔ اور فرض کرو کہ وہ سب کام سلطان کی عادت مستمرہ اور مزاج کے خلاف بھی ہوں۔ تو کیا کسی جاہل اور معاند کو بھی ایسی حالت میں اس شخص کے دعوے کی تصدیق میں کچھ تردد رہے گا۔ اور کیا کوئی بیوقوف بھی یہ حجت کریگا کہ دعویٰ تو اس کا محبوب اور معتمد ہونے کا تھا اور اس کے معتمد ہونے اور سلطان کے کھڑے ہونے میں کوئی مناسبت نہیں اس لئے اس سے اس پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ سلطان اپنی زبان سے اس کے معتمد ہونے کا اقرار نہ کرے۔

ایسے ہی مہمل ہے کہنا چاہیئے کہ تصدیق دعوئی دو طرح پر ہوتی ہے ایک حالی اور ایک مقالی تو گو اس جگہ زبانی اور قولی تصدیق سلطان کی جانب سے نہیں پائی گئی۔ مگر حالی تصدیق جو اس سے بھی بڑھکر ہے حاصل ہو گئی۔ یہی حال بعینہٖ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا ہوتا ہے کہ وہ اپنی نسبت خدا کا وزیر اور معتمد ہونے کا دعوئی کرتے ہیں۔ اور خدا ہر وقت اور ہر جگہ اُن کے دعوئی کو سنتا ہے۔ پھر وہ عادت اللہ کے خلاف بہت سے کاموں کی فرمائش کرتے ہیں۔ تا کہ ان کے دعوے کی سچائی دنیا پر ظاہر ہو جاوے۔ اور خدا تعالیٰ برابر اُن کے حسب مدعا فرمائشوں کو پورا فرماتا رہتا ہے۔ تو کیا منجانب اللہ یہ اُنکے دعوئی کی حالی تصدیق نہیں ہوئی اور ظاہر ہے کہ جھوٹے آدمی کی تصدیق کرنا خود جھوٹ کی ایک قسم ہے تو اس سے اس مدعی کے کاذب ہونے کی صورت میں خدائے برتر کا کذب ثابت ہوا۔ (نعوذ باللہ منہ) حالانکہ خدائے تعالیٰ کا خالق کذب ہونا تو ضروری۔ لیکن قولاً و عملاً کاذب ہونا محال ہے۔

اب اگر کسی کو یہ وہم گذرے کہ یہ سب تقریر اس وقت قابل تسلیم ہے۔ جبکہ معجزہ یا خوارق عادت کا وجود ممکن ہو۔ حالانکہ اس کا امکان ابھی محل تردد میں ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہم معجزہ اسی کو کہتے ہیں کہ جو عقلاً محال نہ ہو۔ لیکن خلاف عادت ہو۔ اور خلاف عادت کے

بھی یہ معنی ہیں۔ کہ عام عادت کے خلاف ہو۔ کیونکہ معجزہ بھی ہمارے نزدیک خدا کی خاص عادت ہے۔ جو خاص خاص اوقات میں خاص خاص مصلحتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ زید مثلاً ہمیشہ سے قمیض پہننے کا عادی ہو۔ مگر عید کے روز ہمیشہ اچکن پہنا کرے تو گو اچکن پہننے کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زید کی عام عادت کے خلاف ہے۔ مگر ایک حیثیت سے یہ بھی اس کی عادت میں داخل ہے۔ اسی طرح آگ سے کسی چیز کا جلا دینا اگرچہ خداوند تعالیٰ کی عام عادت ہے۔ لیکن بعض مواقع میں جبکہ کسی نبی کی تصدیق یا اور کوئی مصلحت ملحوظ ہو تو آگ سے وصف احراق سلب کر لینا بھی اس کی عادت ہے۔ کیونکہ یہ ثابت ہو چکا کہ تمام اسباب و مسببات میں جو کچھ تاثیر ہے۔ وہ خدا کے ارادہ سے ہے۔ وہ جب چاہے سبب کے وجود کو مسبب سے اور مسبب کے وجود کو سبب سے علیحدہ کر سکتا ہے۔ تو جب مشاہدہ سے یا نہایت ثقہ راویوں کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ ایک شخص نے دعویٰ نبوت کا کیا اور بہت سے معجزات دکھلائے اور تمام عمر میں کسی ایک بات میں بھی اُس کے کہنے کے خلاف نہ ہوا تو بیشک وشبہ ایسے شخص کو نبی سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ نبی کاذب کی تصدیق خدائے تعالیٰ قولاً یا عملاً ہرگز نہیں کر سکتا۔ اور وہ اگر ایسا کرے تو دین منجملہ رحمت نہ ہوگا۔

مجھ کو افسوس ہے کہ ہمارے زمانہ کے بعض عقلاء کو معجزات کے ممکن الوقوع ہونے سے انکار ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ وقوع کی صورت میں وہ ان کے نزدیک دلیل نبوت بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کو اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ موسیٰ کے نبی ہونے اور لاٹھی کے سانپ بن جانے میں کیا تعلق پایا جاتا ہے۔ جو ایک سے دوسرے پر استدلال ہو سکے (فاعتبروا یا اولی الابصار)

میرا مقصد تھا کہ اس بحث کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھتا اور ان عقلا کے خیالات کی پوری جانچ کرتا۔ مگر تنگی وقت سے مجبور ہو کر اس مسئلہ کو بھی دوسرے مسائل کی طرح اسی کتاب موعود کے حوالہ کرتا ہوا خاص سرور کائنات آقائے نامدار اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ختم رسالت کے متعلق کچھ تھوڑا سا لکھنا چاہتا ہوں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت

اس بدیہی معیار رسالت کے مان لینے کے بعد جو میں ابھی عرض کر چکا ہوں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ثبوت بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپکے بیشمار علمی و عملی کارنامے اس وقت بھی دنیا کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہیں۔ اور نہ تمام اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے معجزات بلکہ آپکے معجزات کی ہمسری کر سکتے ہیں۔

آپ کے فہم و اخلاق کا موافق و مخالف کو اعتراف کرنا پڑا ہے۔ اور چہار دانگ عالم میں آپکی صداقت کا سکہ بیٹھ گیا ہے۔ اور دنیا کے ہر خطہ میں آپ کا آفتاب فیض لمعہ افگن ہے۔

جب ایک غیر متعصب اور عقلمند آدمی آپکے احوال کا انبیاء سابقین کے احوال سے اور آپ کی تعلیم کا اُن کی تعلیم سے اور آپ کی قوت و ہمت کا اُن کی قوت و ہمت سے مقابلہ کریگا تو یہی اُس کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ آپ کی محض صداقت کا نہیں۔ بلکہ رسالت کا اور رسالت کا نہیں بلکہ ختم رسالت کا زبان و دل سے اقرار کرے۔ عرب کی جہالت، درشت مزاجی، گردن کشی کون نہیں جانتا۔ جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ کوئی کتاب اُن کے پاس آسمانی ہو نہ زمینی اور اُن کے اخلاق کا یہ حال کہ قتل و غارت وغیرہ ایک معمولی حرکت ہو عقل و فہم کی یہ کیفیت کہ پتھروں کو اٹھا لائے۔ اور پوجنے لگے۔ اور گردن کشی کی یہ صورت کہ کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں۔ جفاکشی کی یہ نوبت کہ ایسے ملک میں شاد و خرم عمر گذار دیں۔ ایسے جاہلوں اور خود سروں کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا۔ چہ جائیکہ علم الٰہیات علم معاملات علم عبادات علم اخلاق علم سیاست مدن میں رشک حکماء زمانہ بنا دیا۔ یہانتک کہ دنیا نے ان کی اور ان کے شاگردوں کی شاگردی کی۔ ڈاکٹر لیبان کہتا ہے" اس پیغمبر اسلام اس نبی اُمی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے۔

جس کی آوازنے ایک قوم ناہنجارہ کو جو اُس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہیں آئی تھی۔ رام کیا اور اس درجہ پر پہنچایا کہ اُس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر دیا اور اُس وقت بھی وہی نبی امی اپنی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔"

اگر انصاف کرو تو آپ کے حسنِ اخلاق کا اندازہ کرنے کیلئے یہی کافی ہے کہ آپ نہ کہیں کے بادشاہ تھے۔ نہ بادشاہ کے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ نہ کچھ زیادہ مال و دولت آپ نے جمع کر رکھا تھا۔ نہ باپ دادا نے کوئی اندوختہ میراث میں چھوڑا تھا۔ نہ آپ کے پاس تنخواہ دار فوج تھی۔ نہ اہل وطن آپ کے ہمراہ تھے۔ نہ قبیلہ والوں کو آپ کے مذہب سے ہمدردی تھی۔ ایسی بیکسی اور بے بسی کی حالت میں آپ نے اُن تند خو گنواروں کو ایک صدائے ناموس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھکر اُس وقت ساری دنیا میں کوئی مکروہ آواز نہ تھی۔ اور نہ ایسی صدا دینے والے سے زیادہ اُن کے نزدیک کوئی شخص انکا دشمن اور بدخواہ سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ وہی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی آواز تھی۔ کہ جس نے دفعتہً تمام عرب میں تہلکہ ڈالدیا۔ جس سے باطل معبودوں کی حکومت میں بھونچال آنا شروع ہو گیا۔ اور جس کی چمک سے اس کفر اور جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کوند گئی گویا وہ ایک زور شور کی ہوا تھی۔ جس کے چلتے ہی شرک و بت پرستی کے بادل چھپ گئے۔ اور آفتاب توحید ابر کے پردے

باہر نکل آیا یا ابابیل رحمت تھی۔ جس کی بوچھاڑ نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ اور خدا کے گھر کو ان کی زد سے بچا لیا۔

غرضیکہ ایک ایسے بے یار و مددگار نے ایسی سخت قوم کو ایسے ظلمت کے زمانہ میں ایسے اجنبی مضمون کی طرف ابھارا۔ اور چند عرصے میں ان سب کو ایسا مسخر اور گرویدہ بنا لیا کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں خون گرانے کیلئے تیار ہو گئے۔ گھر بار کو ترک کر دیا۔ زن و فرزند سے بگاڑ لی۔ مال و دولت کو سنگریزوں سے زیادہ حقیر سمجھا۔ اپنے بیگانوں سے آمادہ جنگ و پیکار ہوئے۔ کسی کو آپ نے مارا کسی کے ہاتھ سے آپ مارے گئے۔ پھر دو چار روز کا ولولہ نہ تھا۔ بلکہ آپ کے بعد بھی اسی حالت پر استقلال کے ساتھ جمے رہے۔ یہانتک کہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ فارس و روم کو تہ و بالا کر دیا۔ اور اس پر معاملات میں وہ شائستگی رہی کہ کبھی لشکری نے سوائے مقابلہ جہاد کسی کی ایذا رسانی یا ہتک ناموس کو گوارا نہ کیا۔ یہ تسخیر اخلاق بتلائیے اس سے پہلے زمانہ میں بھی کسی سے ظاہر ہوئی ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی یہی کہے کہ نہیں اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ تو فی الواقع اس سے زیادہ کور چشم تنگ دل متعصب کوئی نہیں ہو سکتا۔ کاش کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھتے اور وہ اپنے اسلام کا واقعہ ان کے سامنے بیان فرماتے۔ یا سلمان فارسیؓ سے جا کر ان کی

داستان سنتے یا عبداللہ بن سلام کی خدمت میں اپنا اعتراض پیش کرتے اور وہ اُن کو اُس کا جواب سمجھاتے۔

مگر یہ تو آپ کے اخلاق کی حالت تھی۔ باقی آپکے علم و فہم کا نشان سب سے بڑا یہی ہے۔ کہ آپ بذات خود امی محض جس ملک میں پیدا ہوئے۔ جہاں ہوش سنبھالا۔ بلکہ ساری عمر گذاری علوم سے یک لخت خالی نہ وہاں علوم دینی کا پتہ نہ علوم دنیاوی کا نشان پھر اس پر ایسا دین ایسے آئین ایسی کتاب لاجواب اور ایسی ہدایات بینات لائے کہ آجتک بڑے بڑے حکماء اُس کا جواب نہیں لا سکے۔ بلکہ بڑے بڑے مدعیان عقل و تہذیب نے اُس کی داد دی۔ قرآن جیسا زندہ اور علمی معجزہ کس پیغمبر کو دیا گیا۔ جس کا مقابلہ کیا باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور کیا باعتبار علوم و معارف کے اور کیا باعتبار تحریف و تبدیل سے محفوظ رہنے کے دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی اور نہ انشاءاللہ تعالیٰ کر سکے گی۔ قرآن کے حق میں ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کہ جو خود قرآن تیرہ سو برس سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے یعنی یہ کہ جس میں ہمت ہو وہ میرا جواب لکھدے۔ مگر آج تک کسی کا حوصلہ نہ ہوا اور نہ ہو گا کہ اُس کی ایک چھوٹی سی سورۃ کی مثال بھی پیش کر سکے ؂

اب میں اُس کے سوا کیا کہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ

اپنی عادات واخلاق میں تمام انبیاء علیہم السلام سے فائق تھے۔ ایسے ہی علوم کے بھی سارے مراتب آپ پر تمام کر دیئے گئے تھے۔ کیونکہ انبیاء سابقین میں نہ ایسا اعجاز علمی کسی کو دیا گیا نہ انکے اتباع میں کسی نے ان علوم کے دریا بہائے جو اہل اسلام نے بہلائے ہیں۔ اور چونکہ صفت علم تمام اُن صفات کی خاتم ہے جو مربی عالم ہیں۔ تو جس کا اعجاز علمی ہو گا۔ گویا اس پہ تمام کمالات علمی کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ اور اسی کو ہمارے نزدیک خاتم الانبیاء کہنا مناسب ہو گا۔ اور چونکہ اس کا دین قیامت تک رہے گا۔ اسلئے اس کی کتاب کا بھی تا قیامت باقی رہنا ضروری ٹھہریگا۔ باقی قرآن کے سوا آپ کے جو اور علمی اور عملی معجزات ہیں ان کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں رہی۔ اور نہ میں قلت وقت کیوجہ سے توریت وانجیل وغیرہ کے بشارات آپ کی نبوت کے متعلق نقل کر سکا۔ جس کسی کو شوق ہو۔ اول مضمون کے واسطے حضرت مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ کے حجتہ الاسلام اور دوسرے کے لئے علامہ ابن القیم کی ہدایۃ الحیاری کا مطالعہ کرے۔

البتہ اس اخیر موقع پر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے۔ کہ آپکے بعد جو علوم وفنون دنیا میں مسلمانوں کے ذریعہ سے پھیلے اور تمدن کے شعبوں کو ترقی ہوئی اس کا بھی قدرے اندازہ غیروں کی زبان سے ہم قارئین کو کرا دیں۔ تاکہ جو لوگ مسلمانوں کو علم اور تمدن کا دشمن بتاتے ہیں۔ اور

پھر اس دشمنی کو ان کی مذہبی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ وہ بھی اپنی کم فہمی اور کوتاہ نظری سے کچھ شرمائیں۔ ترقی علوم و فنون کے متعلق انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ نقل کرتا ہوں۔

"۷۴۹ء سے خلفائے عباسیہ کے عہد میں علم ادب و فنون حکمت کا ظہور ہوا اور المنصور ۷۵۴ء کے ایام حکمرانی سے ہارون رشید ۷۸۶ء تک بڑی فیاضی سے اس کی تربیت ہوئی۔ بہت سے ملکوں سے اہل علم طلب کئے گئے۔ اور پادشاہانہ سخاوت سے ان کی بہت کچھ داد و دہش کی گئی۔ اہل یونان و شام و ایران قدیم کی عمدہ عمدہ کتابیں عربی میں ترجمہ ہو کر شائع اور مشتہر ہوئیں۔ خلیفہ مامون نے سلطان روم کو ساڑھے بارہ من سونا دینا اور ہمیشہ کیلئے صلح اس شرط پر منظور کی کہ لیو فیلسوف کو اجازت دی جائے کہ چند عرصہ کیلئے وہ یہاں آ کر مامون کو فلسفہ و حکمت سکھا جاوے۔ فلسفہ حاصل کرنے کیلئے ایسی زر خطیر صرف کرنے کی بہت کم مثال ملے گی۔ اس مامون کے زمانہ میں بغداد۔ بصرہ بخارا۔ اور کوفہ میں بڑے بڑے مدرسوں کی بنا پڑی اور اسکندریہ او بغداد اور قاہرہ میں عظیم الشان کتب خانے بنائے گئے۔ اسپین میں مدرسہ اعظم مقام قرطبہ کا بغداد کی علمی شہرت کی ہمسری کرتا تھا۔ نویں اور دسویں صدی میں جہاں دیکھو وہاں مسلمان ہی علوم کے حافظ اور سکھانیوالے نظر آتے تھے۔ فرانس اور ممالک فرنگستان کے

جوق در جوق طالب علم اندلس کو آنے لگے! اور ریاضی اور طب عربوں سے سیکھنے لگے۔ اندلس میں چودہ مدرسے اور بڑے بڑے کتب خانے تھے۔ جن میں سے حاکم کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں جمع ہوئیں۔ یہ کیفیت ترقی علم کی جبکہ اس زمانہ سے ملائی جاوے۔ جو قبیل زمانہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گذرا۔ تو ثابت ہے کہ جیسا کہ عرب فتوحات میں سبقت کرتے تھے۔ ایسے ہی ترقی علم میں بھی یہ لوگ تیز رفتار تھے۔ جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ، طب، طبیعیات اور ریاضی میں مسلمانوں نے بڑا ہی کام کیا ہے اور عربی الفاظ جو آج تک علوم حکمیہ میں بولے جاتے ہیں۔ اور بہت سے ستاروں کے نام وغیر ذالک اس بات کی دلیل ہیں کہ یورپ کے اکتساب علوم پر قدیم سے مسلمانوں کو بہت دخل و تصرف ہوا ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں اس سے زیادہ جغرافیہ کا علم بہت کچھ یورپ کو حاصل ہوا۔ ایشیا اور افریقہ میں جغرافیہ کی بہت اشاعت ہوئی اور علیٰ ہذہ جغرافیہ میں پرانی عربی اور سفر و سیاحت کے رسالے تصنیفات ابو الفدا ادریسی۔ لیو افریقانوس، ابن بطوطہ، ابن فضلان۔ بن جبیر البیرونی المنجم اور ان کی تحریریں اب تک مفید اور گرامی قدر ہیں۔ علم تاریخ بھی محنت سے حاصل کیا گیا۔ اور قدیم عربی مورخ جن کا حال ہمکو ملتا ہے۔ محمد الکلبی ہے جو ۸۱۹ء میں گیا۔ مگر اسی زمانہ میں اور کئی ایک مورخ گذرے اور دسویں صدی کے شروع سے تو عرب نے علم

تاریخ پر بہت توجہ کی اور جن لوگوں نے تمام جہان کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا
ان میں اوّل مسعودی - طبری - حمزہ - اصفہانی اور بطریق اسکندریہ ہیں (مسعودی
کی تاریخ کا نام مروج الذہب و معدن الجواہر ہے) اس کے بعد ابو الفرج
اور جارج المکین (ہر دو عیسائی) اور ابو الفدا وغیرہ ہیں - نویری نے
جزیرہ صقلیہ کی تاریخ ایام سلطنت عرب کی لکھی ہے - بہت سے ابواب
عربی تاریخ کے جن میں عیسائیوں کی جنگ مقدس کا بیان ہے - فرانسیسی
زبان میں ترجمہ ہوئے ہیں اور اندلس میں مسلمانوں کی سلطنت کے حالات ابو القاسم قرطبی تیمنی وغیرہ کے قصد
کتابوں میں لکھے ہیں - جو ان کے حالات دریافت کرنے کا زیادہ شوق ہو تو ڈربلو ہیمر کی تصنیفات خصوصاً
وان ہیمر کی کتابوں پر رجوع کرے

عرب کے فلسفہ کو جو یونانی الاصل تھا - قرآن سے وہی نسبت ہے جو اوسط
زمانہ کے معقولات کو عیسائیوں کے کتب مقدسہ سے تھی - یعنی فلسفہ کو دینیات
کا خادم سمجھا جاتا تھا - عربوں نے ارسطاطالیس کی تصنیفات کو بہت پڑھا - اور
اس پر ان کی بہت شہرت ہوئی اور بالآخر تمام فرنگستان میں عربی زبان
سے لاطینی زبان میں ترجمہ کے ذریعے سے اس کی اشاعت ہوئی - گو عرب کو
خود ہی عہد عباسیہ میں ترجمہ کے وسیلہ سے حاصل ہوا تھا - منطق
اور علم مابعد الطبیعہ پر زیادہ توجہ ہوئی - اور مسلمانوں میں اہل فلسفہ یہ لوگ
ہوئے ہیں - الکندی البصری جو نویں صدی عیسوی میں تھا - الفارابی جس

نے ۹۵۴ء میں اصول میں کتاب لکھی۔ ابن سینا جس نے منطق اور علم مابعد الطبیعۃ اور طب کو جمع کیا اور علم کیمیا اور تشخیص امراض و شناخت ادویات بنانے میں بڑی ترقی کی۔ ابن یحیٰ جس کی تحقیق کی بڑی شہرت ہوئی۔ الغزالی جس نے تہافۃ الفلاسفہ تصنیف کی ابوبکر بن طفیل جس نے اپنے حی بن یقظان میں انسانوں کا حیوانوں سے ظہور آنے کا مسئلہ بیان کیا۔ اور اس کا شاگرد ابن رشد جو ارسطاطالیس کے مفسر ہونے میں بڑا مشہور اور گرامی قدر تھا ان لوگوں کا اور انکے مسالک کا بیان شمول سدرس اور زنہ کی کتابوں میں مفصل ملیگا۔ بہت سے ان عرب فیلسوفوں میں طبیب بھی تھے۔ انکے علم خواص ادویہ میں مہارت کامل حاصل کرنیکو نیوست نے معلومات جغرافیہ سے منسوب کیا ہے۔ علم طب اس حیثیت سے کہ وہ ایک علم ہے۔ عرب ہی کی ایجاد ہے جنکو نہایت قدیم اور وسیع ماخذ یعنی ہندی طبیب شروع ہی سے مل گئے تھے۔ معجون بنانے کی کیمیائی ترکیب عربوں ہی نے ایجاد کی۔ اور دواؤں کے مرکب کرنے اور نسخہ لکھنے کی ایجاد بھی انھیں سے ہوئی اور مدرسہ سائرنو کے ذریعہ سے یہ علم فرنگستان جنوبی میں پھیل گیا دواسازی اور زفرا بادین کیوجہ سے علم نباتات اور کیمیا کی حاجت پڑی اور تین سو برس تک کثرت سے ان علوم کی تحصیل ہوتی رہی۔ اور چند سال۔ بغداد اصفہان۔ فیروزآباد۔ بلخ۔ کوفہ۔ بصرہ۔ اسکندریہ۔ قرطبہ وغیرہ میں فلسفہ اور طب کے مدرسے جاری ہوگئے۔ اور طبابت کے ہر صیغہ میں بجز علم تشریح

کے بڑی ترقی ہوئی۔ اسکے استثنار کیوجہ یہ ہے۔ کہ قرآن میں اجسام کی تشریح منع کی گئی ہے۔ علم طب میں یہ لوگ بڑے نامی مشہور ہوئے۔ ہارون کندی ابن سینا جس نے قانون لکھا اور عرصے تک اس فن میں یہی ایک کتاب درس میں رہی۔

علی بن عباس۔ اسحاق بن سلیمان۔ ابوالقاسم اور روش جس نے طب کی تکمیل کی اور علی ابن عیسیٰ وغیرہم ریاضی میں اہل عرب نے بڑی ترقی کی۔ اور الجبر والمقابلہ کو بڑی ترقی دی بغداد اور قرطبہ کے مدرسوں اور رصدگاہوں میں علم ہیئت کمال شوق سے پڑھا جاتا تھا۔

الحسن نے علم مناظرہ دہرایا میں تصنیف کی اور نصیر الدین طوسی نے اصول اقلیدس کا ترجمہ کیا جبیر بن عقلا نے بطلیموس کے علم مثلث پر شرح لکھی۔ اور نظام بطلیموسی کی کتاب مونی کوالہادی اور سیومیوس نے عربی میں ترجمہ کیا اور دسویں صدی عیسوی میں البانی نے زمین کے دائرہ عظیمہ کے ارتفاع پر نظر کی اور محمد بن الجبر الثانی نے رفتار شمس کی دریافت کی التیرجویش نے ثوابت کے بیان میں کتاب لکھی۔ اور ابوالحسن علی آلات علم ہیئت میں تصنیف کی ہے۔

یہ حالت جو انسائیکلو پیڈیا کے ذریعہ سے درج کیگئی۔ مسلمانوں کے علم و فضل کے متعلق تھی۔ اب ان کے چند تمدنی خصوصیات کو سن لینا

چاہیئے۔ فرانس کا مشہور و معروف محقق ڈاکٹر لیبان عربوں کی ملک گیری کی خصوصیات میں لکھتا ہے۔

"یہ خلفاء راشدین جس خوش تدبیری کو کام میں لائے وہ مافوق ان کی سپاہ گری اور فن حرب کے تھی۔ جسے انہوں نے آسانی سے سیکھ لیا تھا۔ شروع ہی سے انہیں ایسے اقوام سے کام پڑا جن پر سالہا سال سے مختلف صورتوں میں مختلف حکومتوں نے ظلم کر رکھا تھا۔ اور اس مظلوم رعایا نے نہایت خوشی کے ساتھ ان نئے ملک گیروں کو قبول کر لیا جن کی حکومت میں انہیں بہت زیادہ آسائش تھی۔ مفتوح اقوام کے ساتھ طریقہ کیا ہونا چاہیئے نہایت صاف و صریح طور پر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اور خلفائے اسلام نے ملک کے اغراض کے مقابل میں ہرگز بزور شمشیر دین کو پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ بعوض اس کے بجز اپنے دین کی اشاعت کرتے جیسا کہ بار بار کہا جاتا ہے۔ وہ صاف طور پر کہہ دیتے تھے۔ کہ اقوام مفتوحہ کے مذاہب اور رسوم و اوضاع کی پوری طرح سے حرمت کیجائے گی۔

اور اس آزادی کے معاوضہ میں وہ ان سے ایک بہت خفیف سا خراج لیتے تھے۔ جو اس مطلوب کے مقابلہ میں جو ان اقوام کے پرانے حکام اس سے وصول کیا کرتے تھے۔ نہایت کم تھا۔ کسی ملک پر فوج کشی کرنے سے پہلے عرب ہمیشہ ان کے پاس سفیروں کے

ذریعہ سے صلح کے شرائط بھیجا کرتے تھے۔ اور یہ شرائط جنکا ذکر المکین نے کیا ہے۔ علی العموم اسی قسم کے کرتے تھے۔ جو عمرؓ نے ۱۷ھ میں باشندگان غزہ کے سامنے جو اس وقت محصور تھا پیش کئے تھے۔ اور یہ شرائط مصریوں اور ایرانیوں دونوں سے کی گئی تھیں۔ وہ شرائط ذیل میں لکھی جاتی ہیں:۔

"ہمارے حاکم نے ہمیں حکم دیا ہے۔ کہ اگر تم قانون اسلام نہ قبول کرو۔ تو ہم تمہارے ساتھ جنگ کریں۔ پس تم بھی ہم سے ملجاؤ۔ اور ہمارے بھائی بن جاؤ۔ اور ہمارے منافع اور ہمارے منصوبوں میں شریک ہو جاؤ۔ اس کے بعد ہم تم سے کوئی برائی نہ کریں گے۔ لیکن اگر تم یہ کرنا نہیں چاہتے تو تم ہمیں اپنی زندگی تک ایک سالانہ خراج بالالتزام دیا کرو۔ اس کے بعد تمہارے بدلے ہم تمام اُن لوگوں سے لڑینگے۔ جو تمہیں ستانا چاہیں یا کسی طرح سے تمہارے دشمن ہوں۔ اور ہم اپنے وعدہ پر مضبوط رہیں گے۔ اگر تمہیں یہ بھی منظور نہیں ہے تو پھر ہم میں اور تم میں بجز تلوار کے کوئی چیز نہیں رہتی اور ہم تم سے اس وقت تک جنگ کرتے رہیں گے۔ جب تک اللہ تعالےٰ کے حکم کو پورا نہ کرلیں"

بیت المقدس کی فتح کیوقت حضرت عمرؓ کا اخلاق ہمپر ثابت کرتا ہے کہ ملک گیران اسلام مفتوح اقوام کے ساتھ کیا نرم سلوک کرتے تھے۔ اور یہ سلوک اس مدارات کے مقابل جو صلیبیوں نے اس شہر کے باشندوں

سے کئی صدی بعد کیا نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ اس
شہرِ مقدس میں بہت تھوڑے اشخاص کیساتھ داخل ہوئے۔ اور آپ نے
سفرائنیس بطریق سے درخواست کی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت میں آپکے
ہمراہ چلے اُسی وقت حضرت عمرؓ نے منادی کرادی کہ میں ذمہ دار ہوں کہ
باشندگان شہر کے مال اور اُن کی عبادت گاہوں کی حرمت کی جائے گی۔
اور مسلمان عیسائی گرجوں میں نماز پڑھنے کے مجاز نہ ہونگے۔
سب سے پہلا سلوک عمر رضی اللہ عنہ نے مصریوں کے ساتھ کیا۔ وہ اس
سے کم نہ تھا۔ اُس نے باشندگان مصر سے وعدہ کیا۔ کہ انہیں پوری مذہب
کی آزادی پورا انصاف بلا رو رعایت اور جائداد کے ملکیت کے پورے
حقوق دیئے جائیں گے۔ اور ان ظالمانہ اور غیر محدود مطالبوں کے عوض
میں جو شاہنشاہان یونانی ان سے وصول کرتے تھے۔ صرف ایک سالانہ
جزیہ لگایا جائے گا۔ جس کی مقدار فی کس تقریباً دس روپیہ تھی۔ رعایائے
صوبہ جات نے اُن شرائط کو اس قدر غنیمت سمجھا۔ کہ وہ عہد و پیمان
میں شریک ہو گئے۔ اور جزیہ کی رقم انہوں نے پیشگی ادا کردی۔ عمال اسلام
اپنے عہد پر اس درجہ مستحکم رہے اور انہوں نے ان رعایا کیساتھ جو ہر روز شاہنشاہ
قسطنطنیہ کے عاملوں کے ہاتھ سے انواع و اقسام کے مظالم سہا کرتے تھے۔
اسطرح کا عمدہ برتاؤ کیا کہ سارے ملک نے بکشادہ پیشانی دین اسلام

اور زبان عربی کو قبول کر لیا ہیں بار بار کہونگا کہ یہ وہ نتیجہ ہے۔ کہ ہرگز بزورِ شمشیر
حاصل نہیں ہو سکتا اور عربوں سے پہلے جن اقوام نے مصر پر حکومت کی وہ
ہرگز یہ کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔

عربوں کی ملک گیری میں ایک خاص بات ہے۔ جو اُن کے بعد کے
ملک گیروں میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ اور اقوام نے بھی مثل بربریوں (جنہوں
نے روم کے ملک کو فتح کیا ہے) یا ترکوں وغیرہ نے ملک گیری کی ہے لیکن
انہوں نے کبھی کوئی تمدن نہیں قائم کیا اور ان کی ساری ہمت اسی طرف
مصروف رہی ہے۔ کہ جہانتک ممکن ہو اقوام مفتوحہ کے مال سے فائدہ
اٹھائیں۔ برخلاف اس کے عربوں نے قلیل زمانہ میں ایک جدید تمدن
کی عمارت کھڑی کر دی اور انہوں نے ایک گروہ اقوام کو اس جدید تمدن
کے ساتھ اپنے مذہب اور اپنی زبان اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔

عربوں کی صحبت کے ساتھ ہی مصر اور ہندوستان کے سے قدیم
اقوام نے اُن کا دین اُن کا لباس اُن کا طرزِ معیشت بلکہ اُن کا طریقہ تعمیر
تک اختیار کر لیا۔ عربوں کے بعد بہت سے اقوام نے انہیں خطوں پر حکومت
کی ہے۔ لیکن پیغمبر اسلام کی تعلیم کا اثر اس وقت تک اُن ملکوں میں باقی
ہے۔ کل ممالک ایشیا و افریقہ میں مراکش سے لیکر ہندوستان تک
جہاں کہیں عرب پہنچے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی زبان ملکوں

میں ہمیشہ کیلئے قائم ہو گیا ہے۔ بہت سے نئے ملک گیروں نے ان ممالک کو عربوں کے بعد فتح کیا ہے۔ لیکن وہ ان سے عربوں کا مذہب عربوں کی زبان کو ہرگز نہ مٹا سکے۔"

یہ شائستہ تمدن جس کا ذکر محقق موصوف نے کیا۔ چند ہی روز میں دریائے سندھ سے اندلس تک پہنچ گیا۔ اور رفتہ رفتہ ہندوستان میں جو ہزارہا معبودوں کا گھر تھا۔ مسلمانوں کے بابرکت قدم آئے اور انہوں نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ روشن کیا۔ اور گویا بت خانہ کے اندر مسجد بنا دی۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے زلزلہ سے جہاں اور قومی عمارات گرنا شروع ہوئیں یہ مسجد بھی انہدام کے قریب آ پہنچی۔ اس پر ایک طرف تو دشمنان اسلام نے اس کی بنیادیں نکال ڈالنے کا ارادہ کر دیا۔ اور دوسری طرف خود مسلمانوں نے اس کی اینٹوں سے اپنے رہنے کے مکانات تعمیر کرنا چاہے۔ اسی پُر خطر وقت میں ایک مرد اسلام کو خدائے تعالیٰ نے بھیج دیا۔ جس نے اس مسجد کی عمارت کو زمانہ کے دست برد سے بچا لیا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ رفیع الشان اور باعظمت بنانے کی کوشش میں کامیاب ہوا۔ یہ رفیع المنزلت عمارت مدرسہ عربی دیوبند ہے۔ جس کا مفصل تذکرہ آپ میرے

اور لوگوں کی رپورٹوں میں پائیں گے۔ اور وہ مرد اسلام قدسی صفات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ ہیں، جنہوں نے اس مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اور جن کے اسم گرامی پہ ہی ہم اپنی اس تحریر کو ختم کر دینا چاہتے ہیں ؎

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے میری زبان کے لئے

اعجاز القرآن

اصل اوّل

"کیوں" کا سوال کہیں نہ کہیں ختم کرنا ضروری ہے

مکوّنات (سب جگت) میں جو جو واقعات و حوادث پیش آتے ہیں ہر چیز پہ یہ سوال کر سکتے ہیں۔ کہ یہ کیوں ہوا؟ مگر ہر شخص کو ناچار ایک جگہ پہنچ کر یہ سوال ختم کرنا پڑے گا۔

تشریح۔ مثلاً لکڑی آگ میں ڈالدی اور آگ نے اس کو جلا دیا۔ تو سوال ہو سکتا ہے۔ کہ آگ نے اُس کو کیوں جلا دیا؟ پانی آگ پر بہایا اور وہ بجھ گئی۔ تو سوال ہو سکتا ہے کہ پانی نے آگ کو کیوں بجھا دیا؟ کسی نے زہر کھایا اور مر گیا، تو سوال ہو سکتا ہے کہ زہر نے اس کو کیوں مارا؟ آم کے درخت پر صرف آم ہی کیوں لگتا ہے؟ یہ سوالات وہاں بھی پیدا ہو سکتے ہیں جہاں آثار کا صدور ارادہ اور اختیار کے توسط سے نہ ہو۔ جیسے

آگ کا جلانا، زہر کا مار ڈالنا، آم کے درخت پر صرف آم ہی کا لگنا۔ آگ اور آم کے درخت اور زہر کے اختیار سے باہر ہے۔ لیکن اگر کہیں توسط ارادہ و اختیار بھی ہو تو وہاں یہ سوال اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے جیسے کوئی کافر اسلام لے آئے یا مسلمان مرتد ہو جائے والعیاذ باللہ منہ۔ تو سوال کر سکتے ہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟

غرض کہ ہر چیز کیوں (سوال) کے تحت میں آسکتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا کہیں کیوں کا سلسلہ بند بھی ہوتا ہے۔ یا نہیں؟ آؤ اس کی تفتیش ہم کسی ملحد اور مادہ پرست کو سامنے رکھ کر کریں۔ مثلاً ایک شخص طاعون کی بیماری سے فوت ہوا تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ طاعون کیوں ہوا۔؟ جواب یہی ملیگا۔ کہ زہریلے جراثیم کے پھیلنے سے۔ ہم پھر دریافت کرینگے۔ کہ جراثیم کیوں پھیلے؟ کہا جائیگا کہ آب و ہوا کی خرابی سے۔ آب و ہوا کیوں خراب ہوئی؟ بس ابھی یا ایک دو کیوں کا جواب دیکر کیوں کا سلسلہ بند ہو جائیگا۔ اور سنئے آگ کیوں جلاتی ہے؟ اس لئے کہ اس میں حرارت مفرطہ ہے۔ حرارت مفرطہ آگ میں کیوں ہے؟ آگے کیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اور اگر ساری دنیا کے فلاسفہ اور حکماء بھی جمع ہو جائیں گے تو اس سے آگے کیوں کا جواب نہیں دے سکتے۔ جو لوگ فاعل مختار کو چھوڑ کر صرف مادہ کے قائل ہو گئے ہیں، اُن سے اور بھی ایک دو باتیں دریافت کرو جن

اجزائے مادہ سے آفتاب بن گیا ہے۔ ان سے چاند کیوں نہیں بنا؟ جن ذرات سے چاند متکوّن ہوا اُن سے بجائے چاند کے سورج کا تکوّن کیوں نہیں ہوا؟ جن مواد سے تاروں کی کروی الشکل ہستیاں موجود ہوئیں ان مواد سے سنگریزے کیوں نہیں بن گئے؟ جن اجزا سے پاؤں کے تلوے بنائے گئے اُن سے سر کی کھوپڑی کیوں نہ بنی؟ ہاتھی کی روح میں جو طاقت ہے کہ وہ بڑی بڑی قوی چیزوں کو مسل ڈالتا ہے۔ وہ چیونٹی کی روح میں کیوں نہ آئی؟ اور یہ چیونٹی کی روح جو ذرا سے اشارہ سے صفحۂ ہستی سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اسقدر کمزور کیوں واقع ہوئی؟ شیر کی روح نے اسقدر قوت کیوں پائی کہ وہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانات کو چیر پھاڑ کر اُن کے پرخچے اُڑا دیتا ہے؟ مقناطیس صرف لوہے کو کیوں کھینچتا ہے گھانس کے تنکوں کو کیوں نہیں کھینچتا؟ لوہا اسقدر بھاری اور روئی اتنی ہلکی کیوں ہے؟ وقِس علیٰ ہذا۔ غرض کہ ارواح کی قوتوں اور مادہ کی استعدادوں اور خواص میں اسقدر تفاوت کیوں ہے؟

ان ہی چند مثالوں سے واضح ہو گیا کہ ہر چیز کی علت اور سبب کی تلاش اور کیوں کے جواب کا سلسلہ کوئی ہستی خواہ وہ خدا پرست ہو یا مادہ پرست، ملحد ہو یا موحد زیادہ دور تک جاری نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ کسی نہ کسی درجہ پر یہ سلسلہ طوعاً وکرہاً خواہ مخواہ بند کرنا پڑیگا۔ اور بند کرنے میں ملحد اور موحد دونوں برابر ہیں۔ البتہ فرق اگر ہے تو بند کرنے کے طریقہ میں ہے۔ مادہ پرست

سوالات مذکورہ کے جواب میں کہیگا کہ مادہ میں جیسی استعداد تھی۔ ویسی صورت قبول کرلی۔ جب یہ سوال کرو گے کہ مادہ میں استعداد کیوں مختلف تھی۔ جواب دینگے کہ آگے سوال نہیں ہوسکتا۔ آم وغیرہ کے سوال میں یہ سنو گے کہ اس کی صورت نوعیہ کا اقتضا یہ ہے اسی طرح سنکھیا کا ہلاک ہونا بھی اس کی صورت نوعیہ پر محول ہے۔ دیکھو بڑے بڑے دہریہ جب وہ ہیولیٰ کی استعداد اور مادہ کی قابلیت اور صورۃ نوعیہ کے اقتضا پر پہنچے تو آگے بڑھتے سے اُن کی بلند پروازی رُک گئی اسی طرح موحد کا حال ہے۔ کہ وہ بھی ایک خاص حد پر پہنچ کر اپنی پرواز کو ختم کر دیتا ہے۔

ملحد اور موحد میں فرق البتہ اتنا فرق ہے کہ ملحد سے جب سوالات کرو گے تو وہ مادہ، صورت نوعیہ، روح کے خواص پر سوالات کو ختم کریگا۔ اور موحد کہے گا کہ جو چیزیں جن خواص و آثار کیساتھ موجود ہیں۔ اللہ جل جلالہ کے علم ازلی محیط میں اُن کا اسی طرح ہونا مناسب تھا۔ اگر مادہ پرست کہے کہ اللہ کے علم محیط میں یہ ہی کیوں مناسب تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تم نے مادہ کی استعداد کے سامنے سر جھکا دیا تو اس میں کیا عیب ہے کہ ہم خدا تعالےٰ کے علم کے سامنے سر جھکائیں؟ اگر تم صورت نوعیہ اور روح و مادہ کے سامنے سجدہ کر کے اور عاجز ہو کر سوالات کے سلسلہ کو بند کر دینے کا حق رکھتے ہو تو ایک موحد کو کون روک سکتا ہے۔ کہ وہ اپنے پیمانہ فہم کو تنگ اور قوۃ ادراک کو علم الٰہی

کی روبرو حقیر و ناچیز سمجھ کر اُس خدائے قدوس و برتر کے سامنے سجدہ کرے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز سجدہ کرتی ہے۔ جہاں تم نے سوال کا سلسلہ ختم کر دیا روح کی قوت اور مادہ کی استعداد پر وہاں میں کہونگا۔ کہ اس کو منتہی کرو۔ اللہ جل جلالہ کے علم محیط ازلی پہ۔ جس طرح مادہ اور روح کے خواص کو تم ازلی کہتے ہو۔ جس میں ارادہ اور اختیار کو کوئی دخل نہیں، اسی طرح خیال کر لو۔ کہ اللہ تعالےٰ کا علم محیط بھی ہمارے نزدیک بلکہ تمام اہل ملل کے نزدیک ازلی ہے۔ خدا کو یہ اختیار نہیں کہ وہ علم کو ایک منٹ کیلئے اپنے سے جُدا کر کے جاہل رہ جائے (معاذ اللہ) خلاصہ یہ کہ خدا یہ اختیار نہیں رکھتا کہ وہ اپنے کو خدا نہ رہنے دے ۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ ۝

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝

اور ہر چیز کی انتہا تیرے رب کی طرف ہے۔

اس کے کاموں کی نسبت سوال نہیں کیا جاسکتا ہاں بندوں سے بازپرس ہو سکتی ہے۔

اور تم کو تو صرف ایک ذرا سا علم دیا گیا ہے۔

پاک ہے تو اے پروردگار جس قدر تو نے بتلا دیا۔ اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ بیشک تو ہی ہے جاننے والا اور حکمت والا۔

وَفِي الحدیث الصحیح فَلْیَنْتَہِ وَلْیَسْتَعِذْ بِاللہِ

جب خدا تک سوال کا سلسلہ پہنچے، تو چاہیے کہ آدمی رک جائے اور اللہ کی پناہ ڈھونڈے

اصل دوم

قدرۃ اور عادۃ میں فرق، عادۃ کے مراتب، خرق عادت کی حقیقت

جو لوگ خدا کی ہستی اور اس کے وجود کے قائل ہیں۔ ناچار ان کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اللہ کی ایک قدرت ہے۔ اور ایک ارادہ اور ایک اس کی عادت ہے اور یہ تینوں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

قدرت اور عادت میں بسا اوقات التباس ہو جاتا ہے۔ مثلاً عام طور پر ایسے امور کے متعلق جو سلسلۂ اسباب و مسببات کے خلاف واقع ہوں کہدیا جاتا ہے کہ یہ امر قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ اور اہل الحاد اسی بہانہ سے بہت سے صحیح مسائل کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا

ہی غلط ہے - کہ یہ امر قانونِ قدرت کے خلاف ہے - یہ لوگ اس لفظ کا غلط استعمال کرتے ہیں - اسوقت میرا منہ تخن دہریوں کی طرف نہیں بلکہ آریوں کی طرف ہے ! اور آریہ بھی قانون قدرت کا لفظ بہت استعمال کیا کرتے ہیں - لیکن خود بھی پرمیشور کو "سروشکتیمان" (قادر مطلق) مانتے ہیں جیسا کہ ہم خدا کو قادر مطلق مانتے ہیں - پس اگر وہ واقعی سروشکتیمان اور قادر مطلق ہے - تو اس کی قدرت میں یقیناً یہ داخل ہے کہ سبب کو بدون مسبب کے اور مسبب کو بدون سبب کے پیدا کر دے - مثلاً آگ موجود ہو مگر نہ جلاوے - یا کوئی چیز جل جاوے مگر آگ موجود نہ ہو - یا مثلاً ہم قادر مطلق کی عادت یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ عورت کے رحم سے نکلتا ہے اور پھر بتدریج نشو و نما پاتا ہے - چنانچہ کسی نے نہیں دیکھا ہوگا - کہ کوئی جوان انسان آسمان سے اترا ہو یا زمین سے اُگ آیا ہو مگر اس عادۃ مستمرہ کے خلاف ماں کے رحم اور نطفہ کے توسط کے بدون انسان کو پیدا کرنا بھی اس سروشکتیمان کی قدرت میں داخل ہے - کیونکہ ان کا مذہب ہے یہ کہ لیل و نہار کی طرح یہ عالم بھی فنا ہو کر پیدا ہوتا رہتا ہے - اور جیسے رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے - اسی طرح عالم کا سلسلہ فنا و بقا کے بعد دیگرے جاری ہے - اور عالم کے فنا کے زمانہ کو وہ "پرلے" کا زمانہ کہتے ہیں اور اس میں ان کے خیال کے موافق سارا عالم فنا ہو جاتا ہے - اور سب کچھ مٹ

مٹا کہ خدا کی ذات میں سما جاتا ہے۔ اور جیسا کہ رگوید میں تصریح ہے۔ صرف پربرہم کی سامرتھ (یعنی خدا کی قدرت) باقی رہ جاتی ہے۔ باقی سب کچھ نیست ونابود ہو جاتا ہے۔ ایک مدت دراز تک اسیطرح عالم فنا میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے پھر پیدا ہوتا ہے۔

اب دنیا کا جو دور چل رہا ہے اُس کا حساب سوامی دیانند نے نہ معلوم کس بہی کھاتہ سے لگا کر یہ کہا ہے کہ "ایک ارب چھیانوے کروڑ کچھ لاکھ کچھ ہزار برس سے یہ دنیا موجود ہے۔ اس سے پہلے غیر متناہی مرتبہ دنیا مٹتی اور پیدا ہوتی چلی آتی ہے۔ اور موجودہ دور بھی اپنے وقت پر جب خدا چاہے گا فنا ہو جائے گا۔"

اس عقیدہ کا رد اسوقت مقصود نہیں۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ جب دنیا پرلے کے بعد نئے سرے سے پیدا ہوتی ہے تو مختلف مخلوقات خصوصًا انسان کہاں سے آتے ہیں؟

سوامی دیانند لکھتے ہیں کہ "پرلے کے بعد جو انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کی پیدائش کی کیفیت متعارف طریقہ سے بالکل علیحدہ ہے یعنی ہزاروں انسان بغیر ماں باپ کے جوان محض خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ سے بدون متعارف سلسلہ اسباب طبعیہ کے بن جاتے ہیں۔ اب جو مذہب یہ کہتا ہے وہ مذہب قطعاً حق نہیں رکھتا کہ وہ اس کے بعد

سر ونکٹیمان کو اس ظاہری سلسلۂ اسباب میں ایسا جکڑ بند کر دے کہ خواہ کیسی ہی حکمت اور مصلحت کا اقتضا ہو مگر وہ ایک منٹ کیلئے ان اسباب کے سلسلہ سے الگ ہو کر کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے بھی مجبور اور عاجز ٹھہرے۔"

جب ان کے اعتراف کے موافق پہلے کے بعد اس عادۃ مستمرہ کے برخلاف غیر متناہی دفعہ ایسا ہو چکا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو خدا اسے ایک (رب سال پہلے رپہ لے کے بعد) قادر تھا کہ بدون ماں باپ کے انسان کو پیدا اور بدون اسباب کے مسببات کو موجود کر دے اب اسکی قدرت کو کس چیز نے سلب کر لیا کہ ایک یا دو ارب سال کے بعد ایسا نہ کر سکے معلوم ہوا کہ خرق عادت یعنی کبھی کبھی سلسلۂ اسباب سے علیحدہ ہو کر محض وسیع قدرۃ کے اظہار کے طور پر کوئی کام کرنا اس کی قدرت کے خلاف نہیں۔ ہاں عام عادت اور معمول کے خلاف ہو گا۔ لہذا اس کو قانونِ عادت کے خلاف کہنا صحیح ہو تو ہو مگر قانونِ قدرت کے خلاف قرار دینا اس لفظ کا غلط استعمال اور مغالطہ دینے والی تعبیر ہے۔

مثلاً اہل اسلام کے عقیدہ کے موافق ابراہیم خلیل اللہ کو آگ میں ڈالا گیا۔ اور وہ نہ جلے تو خدا کی اس عام عادت کے تو خلاف ہوا۔ جو آگ کے متعلق ہے۔ کہ وہ جلانے کا سبب ہے۔ لیکن قدرت کے خلاف نہ ہو گا جس

متے ہی اس میں یہ خاصۂ احراق ودلیعت کیا ہے۔

آریوں کے چار رشیوں کے علاوہ کسی اور سے خدا کا ہمکلام ہونا قدرت کے خلاف نہیں۔ البتہ عادت کے خلاف ہے

آریہ کہتے ہیں کہ ہر پرلے کے بعد چار ویدوں کا الہام چار معیّن اشخاص پر ہوتا ہے۔ جن کے نام بھی لکھے ہیں۔ وایو۔ اگنی۔ آدتیہ۔ انگرا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ یہ چار رشی ہیں۔ گو تاریخ ایسے ممتاز انسانوں کا کوئی پتہ نہیں دیتی اور نہ ان کی کوئی سوانح بتلا سکتی ہے۔ بلکہ ان کو چار انسان بتانا بھی سوامی دیانند کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ جو ان ہی کے دائرہ اثر تک محدود ہے۔ دوسرے بڑے بڑے فرقے ہنود کے اس کی تشریح دوسری طرح پر کرتے ہیں۔ تاہم مجھے اسوقت اس سے بحث نہیں مجھے تو یہ کہنا ہے کہ آریہ سماج کے نزدیک ہر پرلے کے بعد ان ہی چار رشیوں پر چار ویدوں کا الہام جگ کی ابتدا میں ہوتا ہے۔ بعد میں کوئی کتاب کسی پر نہیں اترتی اور ہر پرلے کے بعد وہی چار وید اترتے ہیں۔ جو کہ پہلے اتر چکے ہیں۔ ان میں بھی تغیر اور تبدل نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ ان ہی چار رشیوں سے ابتدائے آفرینش میں کلام کرتا ہے۔ اور کسی سے نہیں کرتا۔ گویا خدا کا بندوں سے ہمکلام ہونا اس کی عام عادت نہیں بلکہ خاص عادت ہے۔ جو خاص زمانہ میں مخصوص بندوں کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ خدا اس سے مجبور اور عاجز

نہیں کہ اگر وہ چاہے تو کسی اور سے بھی کسی وقت کلام کر لے۔ تو مجھے اس وقت یہ کہنا ہے۔ کہ ہندو آریوں کے اصول کے موافق بھی دو چیزیں الگ الگ ہوئیں۔ ایک قدرت اور ایک عادت۔ اور یہ کہ عادت کے خلاف کوئی کام کرنا بھی قدرت سے خارج نہیں ہے۔ پس اسباب سے مسبب کا پیدا کرنا خدا کی عادت ہے۔ اور بلا سبب کے مسبب بنا دینا قدرۃ کا کام ہے۔ اسباب کا سارا سلسلہ قدرت کا بنایا ہوا ہے۔ نہ یہ کہ قدرت اسباب کی بنائی ہوئی ہے۔ اور اس لئے قدرت تو اسباب پر حاکم ہو گی۔ لیکن اسباب معاذ اللہ قدرت کے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ڈال سکتے۔ قرآن کریم نے بھی قدرت اور عادت میں فرق کیا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

یہ تو اللہ کی قدرت اور ارادہ کا تفاوت ہوا۔ اب عادت کا بیان سنئے، فرماتے ہیں:۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔	یہی فطرۃ (نیچر) ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کے (قانون) پیدائش کو کوئی بدل نہیں سکتا۔
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝	خدا کی عادت میں تم ہرگز کوئی تبدیل و تغیر نہ پاؤ گے
سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ	یہ خدا کی عادت ہے جو اپنے بندوں کے

فی حیاتہ ۵ | متعلق پہلے سے چلی آتی ہے۔

یہ غیر متبدل سنت اللہ عادۃ اللہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عادت اور قدرت میں فرق ہے۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ کوئی شخص ہمیشہ عمامہ باندھنے کا عادی ہے۔ یا کوئی ہمیشہ چاول کھاتا ہے۔ یہ تو اس کی عادت ہو گی۔ مگر باوجود اس کے بھی وہ ٹوپی اوڑھنے یا روٹی کھانے پر قادر ہے۔ اسی کا نام قدرت ہے۔ ہر انسان اپنے اندر اس بات کو پاتا ہے۔ مثلاً لڑکا اپنے ناتواں باپ کو مار سکتا ہے (یہ اس کی قدرت ہے) مگر نہیں مارتا۔ یہ اس کی عادت ہے۔

عادت عامہ و خاصہ | ہاں عادت میں بھی تفصیل ہے۔ ایک عادت عام غیر موقت اور مستمر ہوتی ہے۔ ایسی عادت سے ہر خاص و عام واقف ہوتا جاتا ہے اسی کو نقل کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہوا۔ اور اساتذہ کی عام عادت دیکھی تو وہ یہاں سے جا کر اسی عادت کو نقل کریگا۔ جو مدت قیام میں روزمرہ مشاہدہ کرتا رہا ہے۔ دوسری عادت موقت یعنی خاص وقت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اس کو عادت خاصہ کہنا چاہیئے۔ مثلاً کوئی ہمیشہ روٹی کھاتا ہے۔ مگر عید کے روز ہمیشہ چاول کھایا کرتا ہے پس جس شخص نے اس کو عید کے روز چاول کھاتے نہ دیکھا ہو وہ کہیگا کہ چاول کھانا اس کی عادت نہیں۔ مگر جس نے دس بیس مرتبہ عید کی عادت بھی دیکھی ہے۔ وہ

کہیگا کہ روٹی کی طرح چاول کھانا بھی اس کی عادت میں داخل ہے۔ ایک عام مستمر عادت ہے، دوسری خاص موقت۔ دونوں اپنے اپنے خیال اور تجربہ کے موافق درست کہتے ہیں۔ مگر دوسرے کا کہنا مطابق واقعہ ہے۔ اس لئے کہ اس کو اُس شخص کے تمام زمانہ پر نظر ہے۔ وہ جیسا عادتِ عامہ سے واقف ہے ویسا ہی عادت خاصہ سے بھی آگاہ ہے۔

یاد رکھو! جس کا نام ہم معجزہ رکھتے ہیں۔ وہ بھی ایک فعل اللہ تعالےٰ کا ہے جو اس کی عام عادت کے گو خلاف ہو مگر عادتِ خاصہ کے خلاف نہیں ہوتا، بلکہ اس کے مطابق اور موافق ہوتا ہے۔ کیونکہ خاص خاص اوقات اور خاص خاص مصلحتوں کے وقت عام عادت کے توسط کو چھوڑ کر محض قدرت سے خوارق اور معجزات کا ظاہر کرنا یہ بھی اللہ تعالےٰ کی خاص عادت ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو ہم نہایت متحمل مزاج، حلیم الطبع سمجھتے ہیں۔ کہ ہزار گالیاں سننے پر بھی غصہ نہیں آتا۔ مگر اس کی طبیعت میں یہ بھی ہے۔ کہ مذہب پر اگر کوئی حملہ کرے تو باوجود اسقدر بردباری کے غصہ سے بیتاب ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کیا یہ اس کی عادت نہیں سمجھی جائے گی؟

اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے کہ اسباب سے مسببات کو پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی اس کی عادت ہے۔ کہ جب اپنے مقربین (انبیاء کرام) کی تصدیق کرانا ہوتی ہے تو ان کے ہاتھوں پر وہ علامات ظاہر کرتا ہے۔ جس سے لوگ

سمجھیں کہ بیشک یہ اُس کے مقربین اور معتمد خاص ہیں۔ جن کے دعویٰ کی تصدیق کے لئے وہ خلاف معمول چیزیں پیش کر کے ساری مخلوقات کو اس کی مثل لانے سے عاجز کر دیتا ہے۔ اور یہی ہونا بھی چاہیئے۔ عقل اور فطرۃ کا اقتضا بھی یہی ہے۔ کہ خدا اپنے خاص بندوں کیساتھ وہ معاملہ کرے جو دوسروں سے نہ کرے۔ کیا ایک گاؤں مکھیا یا نمبردار کے کہنے سے وائسرائے وہ کام کر سکتا ہے جو کہ ایک صوبہ کے گورنر کے کہنے سے کرتا ہے؟ ماں، باپ، بیوی، احباب، اقارب، حکام، رعایا غرض ہر ایک کیساتھ انسان کا معاملہ اور اس کی عادت جداگانہ ہوتی ہے۔ جو ثابت کرتی ہے کہ یہ حاکم ہے، یہ محکوم ہے۔ اور یہ باپ ہے، یہ لاڈلا بیٹا ہے۔ بسا اوقات جو بے تکلفی یا خلاف طبع امور کا تحمل آدمی اپنے مخلصوں اور دوستوں کی رعایت سے کر لیتا ہے۔ وہ ہرگز ساری دنیا کے دباؤ سے نہیں کر سکتا۔ ایک استاذ کا خاص خاص شاگردوں کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے۔ وہ تمام طلبہ سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں میں عام عادت سے علیحدہ معاملہ کرنا ہی قرین قیاس اور عقل و فطرۃ کے موافق ہے تاکہ قریب کا قریب اور بعید کا بعید ہونا لوگوں پر واضح ہو جائے۔ اس امر کو ملحوظ رکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ معجزہ فطرۃ کا مقتضا ہے۔ اس کے مخالف کیونکر ہو سکتا ہے۔ بلکہ اگر معجزات ظاہر نہ ہوں۔ تو یہ حکمت کے خلاف ہو گا۔ سفاہت ہو گی ع گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی۔

جو لوگ خدا کے یہاں وجیہ ہیں اپنی جان، اپنی آبرو ہتھیلی پہ رکھ کر خدا کیلئے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور خدا ہی اُن سے یہ دعویٰ کراتا ہے۔ کہ آج تمہاری سب کی نجات میرے اتباع میں منحصر ہے۔ ضروری ہے کہ اُن کی وجہ سے عام عادت سے بالاتر کارنامے خدا کی قدرت کے ظاہر ہوں۔ جو کہ تمام دُنیا کو اپنی نظیر پیش کرنے سے تھکا دیں۔ اور تمام مخلوق کو عاجز کر دیں۔ یہی معنی ہیں معجزہ کے۔ یاد رکھئے کہ معجزہ خدا کا فعل ہوتا ہے، اس کو نبی کا فعل سمجھنا سخت غلطی ہے۔

معجزہ خدا کا فعل ہے معجزہ قانون عادت عامہ کے خلاف اور عادت خاصہ کے موافق اللہ کا ایک فعل ہے۔ جو کہ تمام مخلوق کو تھکا دینے اور عاجز کر دینے والا ہوتا ہے۔ تاکہ اللہ تعالےٰ سچے مدعی نبوت کا وہ رتبہ تمام جہان پر واضح کر دے۔ جو کہ اسکے یہاں اُس کو حاصل ہے۔ اور یہی حکمت کا اقتضا بھی ہے۔ کیا میں اپنے بیٹے کیساتھ جو عادت برتونگا۔ وہی ایک عامی آدمی کیساتھ بھی کروں گا؟ نہیں! بلکہ جیسے تعلقات ہوتے ہیں۔ ویسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اللہ کے ساتھ بھی جن کا جیسا تعلق ہو، ویسا ہی ادھر سے معاملہ اور برتاؤ بھی ہو۔ یہی معجزہ کی حقیقت ہے۔ جس سے آج کل کے مادہ پرستوں کو اسقدر گھبرانے اور وحشت کھانے کی ضرورت نہیں۔

ہم نے خدا کو اس کے کاموں سے پہچانا ہے

اس کے بعد ہمیں سوچنا چاہیئے کہ وہ کیا چیز ہے جس نے ہم کو خدا کے ماننے پر مجبور کیا؟

جواب:۔ سو یہ بات ظاہر ہے کہ جب ہم کائنات میں مختلف افعال و آثار دیکھتے ہیں تو بعض ان میں سے ایسے ہیں۔ جن کو ہم کسی سبب کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ مثلاً بیمار نے دوائی، اچھا ہو گیا۔ یہ صحت یابی دوا کی طرف منسوب ہو گئی۔ چھت گری اور اس کے نیچے کوئی دب کر مر گیا، بجلی گری اندر کوئی شخص جل گیا۔

اور بعض ایسے ہیں جن کو کسی سبب کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ جیسے کسی پر بجلی گری مگر نہیں مرا، یا چھت گری۔ مگر وہ زندہ نکلا۔ اس قسم کے واقعات کو کسی سبب پر محول نہیں کرتے۔ بلکہ کہتے ہیں۔ کہ محض خدا کی قدرت نے ایسا ہوا۔ کیونکہ یہاں بظاہر اسباب کا سلسلہ اُس واقعہ کے مخالف تھا۔ چاند سورج کو گہن لگتا ہے۔ اس کا سبب بیان کیا جاتا ہے۔ بارش برستی ہے اس کا سبب بیان کرتے ہیں۔ لیکن اسباب کا سلسلہ ضرور کہیں نہ کہیں جا کر بند کیا جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ یہ چیزیں قدرتی ہیں۔ غرض قدرتی چیزیں وہ کہلاتی ہیں۔ جن کا بنانا تمام مخلوقات کی قدرت سے باہر

ہو اور جس کو دیکھ کر لامحالہ ایک قادر مطلق کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے حق تعالےٰ نے ایسی اشیاء کے وجود سے اپنے وجود پر استدلال فرمایا ہے۔ قرآن عزیز میں فرماتے ہیں :-

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ
الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ
النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ
فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ
الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ه

بلا شبہ آسمانوں کے اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے ادل بدل میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزیں مال تجارت وغیرہ سمندر میں لیکر چلتے ہیں اور مینہ میں جو اللہ آسمان سے برساتا پھر اس کے ذریعہ زمین کو اسکے مرے پیچھے دوبارہ زندہ کرتا ہے اور ہر قسم کے جانوروں میں جو خدا نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھیرنے میں اور بادلوں میں جو خدا کے حکم سے آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں غرض ان سب چیزوں میں ان لوگوں کیلئے جو عقل رکھتے ہیں قدرت کی بہتیری نشانیاں موجود ہیں

آسمان اور جو سیارات اس میں ہیں۔ جیسے چاند اور سورج وغیرہ۔ ان سب کا وجود قدرتی ہے ان کی پیدائش کو کسی مخلوق کا فعل نہیں کہہ سکتے کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے مثل بنانیکا حوصلہ نہیں کر سکتی

زمین ہے کہ جس سے ہر قسم کی غذائیں اور رنگ برنگ کے پھل پھول نکلتے ہیں۔ کسی کی طاقت نہیں کہ ایک ٹکڑہ اس جیسی زمین کا بنا دے۔ سورج ایک معین اور مضبوط

نظام کے ماتحت ہمیشہ دن کو نکلتا ہے۔ شام کو غروب ہو جاتا ہے۔ کسی کی کیا طاقت ہے۔ کہ اس کو ایک منٹ، یا ایک سکنڈ کے لئے روک لے۔ ہوا ہے کہ اس پر کسی کا قابو نہیں، انسان چاہتا ہے کہ پچھوا چلے مگر پروا چلتی ہے۔ سارا جہان ملکر پانچ منٹ کے لئے بھی پچھوا نہیں چلا سکتا۔ پانی کے بھرے ہوئے بادل کڑکتے اور گرجتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ مگر کسی کو اختیار نہیں۔ کہ بارش حاصل کر سکے۔ زمین و آسمان کے درمیان بادل لٹکا ہوا ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ دو قطرے لے سکے، اور جب برستا ہے تو کسی کی قدرت نہیں کہ روک سکے! جب ان امور کو انسان دیکھتا ہے اور عاجز ہو جاتا ہے۔ تو قدرت کو ماننا پڑتا ہے۔ طوفان خیز سمندر میں جہازوں کا چلنا، ہواؤں کا ادل بدل یہ سب چیزیں کسی کے قبضہ میں نہیں۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝

اور سورج ہے کہ چلا جا رہا ہے اپنے ٹھکانے کی طرف۔ یہ اندازہ ٹھہرایا ہے زبردست حکیم کا باندھا ہوا۔ اور چاند ہے کہ مقرر کر دی ہے ہمنے اس کی منزلیں یہانتک کہ پھر لوٹ کر رہ جاتا ہے۔ کھجور کی پرانی ٹہنی کیطرح۔ نہ تو سورج کو یہ لائق ہے کہ وہ جا پکڑے چاند کو اور نہ رات کی مجال ہے۔ کہ وہ آ جائے دن ختم ہونے سے پہلے۔ اور ہر سیارہ پڑا اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے۔

یہ سب اس لیے ذکر کیا گیا کہ آپ سمجھ لیں کہ خدائی کام اور انسانی کاموں میں کس طرح تمیز ہوتی ہے۔ خدائی کام وہ کہلاتا ہے کہ اس جیسا کرنے سے سب مخلوق عاجز ہو۔ ازل و ابد کے انسانوں کو بلاؤ۔ لیکن کوئی نہ کر سکے یہی استدلال ابراہیم علیہ السلام نے بھی کیا تھا۔ پہلے حیات و ممات کے متعلق سوال کیا۔ جب اس میں مخاطب (نمرود) کی عنادت دیکھی تو فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ میرا رب ایک قاعدہ سے ایک ضابطہ سے شمس کو چلاتا ہے۔ خدائی کام وہ کہلاتا ہے کہ دنیا میں اس کا مقابلہ کوئی طاقت نہ کر سکے۔

خدائی کام کی طرح خدائی کلام کو بھی سمجھنا چاہیے	ٹھیک اسی طرح خدائی کلام وہ ہے۔ کہ ساری دنیا م جیسا کلام بنانے سے عاجز اور درماندہ ہو۔ ساری دنیا کو لا

جائے۔ غیرت دلائی جائیں مقابلہ کے لیے کھڑا کیا جائے اور لوگ چاہیں کہ کسی طرح یہ روشنی بجھ جائے۔ مگر پھر بھی ویسا کلام بنا کر نہ لا سکیں تو ہم سمجھیں گے کہ یہ خدائی کلام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح خدائی کاموں کو بندوں کے کاموں سے الگ کر کے پہچان سکتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں میں بیّن اور واضح فرق ہوتا ہے۔ گلاب خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اب تم بھی کاغذ کے پھول بناتے مگر جب تمہارے پھول پر پانی کا ایک چھینٹا پڑ جاتا ہے تو آپ کی صنعت کا سارا پول کھل جاتا ہے۔ لیکن قدرتی پھول پر پانی گرتا ہے تو اس میں اور زیادہ صفائی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

معجزہ کوئی فن نہیں

بلا شبہ خدائی کام اور بندوں کے کام میں نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔ خدائی کام کی نقل بندہ اتارتا ہے۔ لیکن عاقل کو کبھی التباس بھی نہیں ہوسکتا۔ انسان جانداروں، درختوں، پھولوں کی تصویر کھینچ لیتا ہے۔ مگر ایک مچھلی کی آنکھ، ایک مکھی کا پر، ایک مچھر کی ٹانگ، بلکہ ایک جو کا دانہ تمام عالم ملکر بھی نہیں بنا سکتا۔ لاکھوں مجسمے، کروڑوں بیل بوٹے دنیا کے صناع بناتے ہیں۔ مگر مچھر کا ایک پر بنانے سے بالکل عاجز ہیں۔

لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ — کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ پیدا کریں ایک مکھی کو اگرچہ وہ سب اس کام کیلئے اکٹھے ہو جائیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا — اللہ محجوب نہیں ہوتا اس سے کہ بیان کرے مثال مچھر کی۔ اور اُس سے بھی زیادہ کمتر اور حقیر چیز کی۔

اسی کا نام خدائی فعل ہے اور جب ایسا فعل بدون اُن اسباب کے جو کہ اُس کے تکوّن کیلئے متعارف ہیں، کسی مدعی نبوت کے ہاتھوں پر ظاہر ہو تو اسی کا نام معجزہ ہو جاتا ہے، خواہ وہ جنسِ افعال سے ہو یا جنس اقوال سے۔ اور جب کہ یہ ثابت ہوا کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ جو بدون تعاطی اسباب کے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ تو دوسرے خدائی کاموں کی طرح اس میں بھی کسی صانع کی صنعت کو دخل نہیں ہو سکیگا۔ پس تنجیم، کہانت،

مسمریزم ،سحر، شعبدہ کی طرح معجزہ کوئی فن نہیں ہے جو کہ تعلیم و تعلم سے حاصل ہوتا ہو۔ یہ فنون سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن معجزہ میں نہ تعلیم و تعلم ہے۔ نہ انبیاء کا کچھ اختیار اس میں چلتا ہے۔ نہ معجزہ صادر کرنے کا کوئی خاص ضابطہ اور قاعدہ ان کو معلوم ہے کہ جب چاہیں ویسا ہی عمل کر کے ویسا ہی معجزہ دکھلا دیا کریں۔ بلکہ جس طرح ہم قلم لیکر لکھتے ہیں۔ اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلم لکھتا ہے اور فی الحقیقت اسکو لکھنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہی صورت معجزہ کی بھی ہے۔ ایسا نہیں کہ انبیاء جسوقت چاہیں۔ مثلاً انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر سکیں بلکہ جسوقت اللہ کی حکمت بالغہ مقتضی ہوتی ہے۔ تو جاری ہو سکتے ہیں۔ برخلاف ان فنون کے جو تعلیم و تعلم سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان میں جس وقت چاہیں قواعد مقررہ اور خاص خاص اعمال کی پابندی سے یکساں نتائج اور ایک ہی طرح کے آثار و کیفیات دکھلائے جا سکتے ہیں۔ مگر آج تک مدعیان نبوت و اعجاز کی طرف سے کوئی درسگاہ معجزہ سیکھنے سکھانے کی نہ بنی نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ ممہد ہوا۔ نہ کوئی کتاب تنجیم، مسمریزم، سحر کی طرح معجزات میں تصنیف کی گئی۔ بلکہ وہ خدا کا فعل ہے جو تمام دنیا کو تھکا دیتا ہے۔ اگر وہ فعل ہے تو اس جیسے فعل سے دنیا عاجز ہے اور اگر اقوال میں سے ہے تو اس جیسے کلام سے تمام دنیا کے بولنے والے

مجبور اور درماندہ ہیں، رسول کے اختیار یا قدرت کو بھی اس میں کوئی
دخل نہیں۔ اسی واسطے انبیاء سے جب معجزات طلب کیے گئے۔ تو انہوں
نے اللہ پہ محول کیا۔ فرماتے ہیں۔

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى
تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا ؕ
اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ
نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ؕ اَوْ تُسْقِطَ
السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا
كِسَفًا ؕ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ
الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ؕ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ
بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى
فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ
لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا
كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ
رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا
رَّسُوْلًا ؕ

اور وہ تم سے کہتے ہیں۔ کہ ہم تو اس وقت تک
تم پر ایمان لانے والے نہیں۔ کہ یا تو ہمارے لئے زمین
سے کوئی چشمہ بہا نکالو۔ یا کھجوروں اور انگوروں کا
تمہارا کوئی باغ ہو۔ اور اس کے بیچ میں تم بہت سی نہریں
جاری کر دکھاؤ۔ یا جیسا تمہارا خیال ہے آسمان کے ٹکڑے
ہم پر لا گراؤ۔ اور خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا
کرو۔ یا رہنے کے لئے تمہارا طلائی گھر ہو۔ یا آسمان
پہ چڑھ جاؤ۔ اور جب تک تم وہاں سے
ایک کتاب اتار کر نہ لاؤ۔ کہ ہم آپ
اس کو پڑھ بھی لیں۔ ہم تمہارے
چڑھنے کو بھی باور کرنے والے
نہیں۔ کہہ دو اے محمد صلعم، کہ میں
رسول تو ہوں۔ مگر بشر رسول ہوں۔

خدا نہیں ہوں۔ (یعنی معجزہ تو بشر کا فعل نہیں ہے، خدا کا فعل ہے) میرے قبضہ میں یہ نہیں کہ جو تم چاہو تمہیں دیدوں، بلکہ جسقدر خدا میری تصدیق کی علامات کے طور پر کافی اور مناسب جانتا ہے۔ ظاہر کرتا ہے۔

معجزہ کچھ ایسے حالات کے ساتھ آتا ہے کہ اس میں شبہ کی گنجائش نہ رہے

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی اور معجزہ دکھلانے کیلئے عصا ڈالا اور وہ اژدہا بن گیا۔ اس کا جواب دینے کیلئے فرعون نے بڑے بڑے ساحروں کو جمع کیا، اور وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی لاٹھیاں و رسیاں لیکر پہنچگئے، وہ سمجھے ہوئے تھے کہ موسیٰ بھی ہمارے ہم پیشہ ساحر ہیں۔ اسی لئے کہا اِمَّآ اَنۡ تُلۡقِیَ وَاِمَّآ اَنۡ نَّکُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِیۡنَ تم پہلے ڈالو گے یا ہم۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم پھینکو۔ جب انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں اور وہ چلتے ہوئے سانپ نظر آنے لگے تو فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی (موسیٰ اپنے دل میں ڈرے۔ حالانکہ اگر وہ بھی پیشہ ور ساحر ہوتے تو ڈر کی کوئی وجہ نہ تھی۔ شیخ اکبر رح فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ خوف کیوں طاری ہوا؟ اور کیوں طاری کیا گیا؟ یعنی خوف کا منشا کیا تھا اور اس کے طاری کئے جانے میں حکمت کیا تھی؟

اگر یہ کہا جائے کہ سانپوں کی صورت دیکھ کر ڈر گئے تو موسیٰ جیسے پیغمبر کو ان لاٹھیوں سے کوئی خوف نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ اسی نوعیت

کے اعلیٰ خوارق کا تجربہ بھی دو مرتبہ کر چکے تھے - پہاڑ پہ جو واقعہ القائے عصا کا ہوا تھا اُس پہ لَا تَخَفْ سُن چکے تھے - کیونکہ وہاں بھی خائف ہوئے تھے -

وَلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ لَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝	اور اللہ نے وہیں ڈر اور خوف نکال دیا تھا اے موسیٰ ڈرو مت یہاں انبیاء ڈرا نہیں کرتے -

پھر دوسری مرتبہ فرعون کے سامنے بھی لاٹھی ڈالکر دیکھ چکے تھے - شیخؒ فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ پہاڑ پہ بشری خوف تھا - جو کہ وہیں نکل چکا تھا - اب جو دوسری دفعہ طاری ہوا یہ اس وجہ سے کہ موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ میرے ہاتھ میں کوئی طاقت نہیں کوئی قدرت نہیں کہیں ساحرین کی اس شعبدہ بازی کے سامنے حق کا کلمہ پست نہ ہو جائے اور بیوقوف لوگ فتنہ میں نہ پڑ جائیں چنانچہ جواب میں ارشاد ہوا -

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی	ڈرو مت تم ہی اونچے ہو کر رہو گے -

یہ تو خوف کا منشا تھا - اب اس کی حکمت فرماتے ہیں کہ جب ڈر گئے اور ڈرے ہوئے آدمی پہ خوف اور گھبراہٹ کے جو آثار ہویدا ہوتے ہیں - ان کو محسوس کر کے ساحرین سمجھے کہ یہ ہمارے پیشہ کا آدمی ہرگز نہیں یا کم از کم اس کو کوئی ایسا ساحرانہ عمل معلوم نہیں جس سے یہ ہمارے مقابلہ میں اپنے

قلب کو مطمئن رکھ سکے۔ اب جو موسیٰؑ نے اپنا عصا ڈالا جو باذن اللہ اُن تمام جادو کے سانپوں کو نگل گیا۔ تو ساحرین نے یقین کر لیا کہ یہ سحر سے بالا تر کوئی اور حقیقت ہے۔ وہ سب بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور چلا اُٹھے کہ ہم بھی موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون نے بہت کچھ دھمکیاں دیں اور خوفزدہ کرنا چاہا مگر اُن کا جواب صرف یہ تھا کہ

فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا اِنَّا اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَا اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ۔ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی۔

جو کچھ تجھے فیصلہ کرنا ہے کر گذر۔ تو اس سے زیادہ نہیں کر سکتا کہ صرف اسی دنیا کی (چند روزہ) زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے ہم تو اپنے (حقیقی) پروردگار پر ایمان لا چکے ہیں تاکہ وہ ہماری خطائیں اور اُن ساحرانہ حرکتوں کو معاف فرمائے جو تو نے ہم سے زبردستی کرائیں اور اللہ سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

اور جو لوگ ایسی آیات بینات کو دیکھ کر بھی راہ حق پہ نہ آئے ان کا بھی حال یہ تھا:-

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ظلم سے اور زیادتی سے حالانکہ انکے دلوں کو اسچائی کا پورا پورا یقین حاصل تھا۔

خود فرعون کو خطاب کر کے حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں:-

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا

تو خوب جانتا ہے کہ یہ آیات آسمان اور زمین

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَائِرَ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا۔ کے پروردگا۔ کے سوا کسی نے نہیں اتاری اور فرعون! بیشک میں تجھے سمجھتا ہوں کہ تو (اس علم کے باوجود) ہلاکت میں گر چکا ہے۔

معجزہ میں دعویٰ نبوت کی شرط کیوں لگائی گئی	معجزہ میں دعوی کی شرط بھی کی گئی ہے۔ یعنی نبی نبوت کا دعویٰ بھی کرے

اس کی وجہ یہ ہے کہ سب فرقے مانتے ہیں کہ خدا سب سے زیادہ سچا ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا اور جھوٹ کے نقص سے اس کی ذات پاک ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ جھوٹ کبھی تو اسطرح ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص خود خلافِ واقع بات کہے اور کبھی اسطرح کہ جھوٹی بات جو دوسرے نے کہی ہے اُس کی تصدیق کر دے۔ پھر تصدیق بھی دو طرح سے ہوتی ہے کبھی زبان سے کبھی عمل سے۔ اور یہ عملی تصدیق بسا اوقات قولی تصدیق سے بڑھ کر موثر ہوتی ہے۔ جیسے ایک شخص بادشاہ کی مجلس میں یہ کہتا ہے کہ بادشاہ کو میرے ساتھ خاص الفت یا رعایت ہے، میں اُس کا معتمد خاص ہوں، جو میں کہوں گا بادشاہ ضرور تسلیم کریگا اور یہ اُس کے دعاوی بادشاہ مجلس میں خود سن رہا ہو۔ اس کے بعد وہ شخص اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے بادشاہ سے کہتا ہے کہ فلاں شخص کو خط لکھ دیجئے، فلاں حاکم کو معزول کر دیجئے، فلاں امیدوار کو عہدہ دے دیجئے۔ پھر کہتا ہے کہ آپ ذرا

کھڑے ہو جائیے۔ پھر کہتا ہے کہ آپ بیٹھ جائیے اور بادشاہ بھی از راہِ مہربانی اپنے عام ضابطہ اور عادت کے خلاف اس کے کہنے کے موافق کرتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ بادشاہ نے اس کے قول کی عملی تصدیق کر دی جو کہ قولی تصدیق سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے۔ اگر بادشاہ قول سے تصدیق کرتا تو شاید اتنا مؤثر نہ ہوتا۔

اتنی بات اس مثال میں ضرور ہے کہ بادشاہ ایک انسان ہے۔ وہ جھوٹی تصدیق بھی کر سکتا ہے۔ مگر اللہ جل شانہٗ کے یہاں جھوٹ اور کذب کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

پس جو نبی دعویٰ کرتا ہے۔ کہ میں نبی ہوں، اگر میری بات سنو گے، مانو گے تو نجات ہے ورنہ عذاب مخلد میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ نجات کا راستہ منحصر ہے میری متابعت میں اور یہ دعوے اللہ کے سامنے کرتا ہے، اللہ کی زمین پر اور اس کے آسمان کے نیچے باآواز بلند کہتا ہے۔ کہ میری متابعت کے بغیر کوئی راستہ نجات کا نہیں ہے۔ اور اسکی یہ دلیل پیش کرتا ہے۔ کہ اللہ جل شانہٗ میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائیگا جو اُس کی عام عادت کے خلاف ہونگی۔ اور دُنیا اُن کی مثال لانے سے عاجز ہو گی۔ پھر اس کے موافق مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو تو یہ خدا کی جانب سے عملاً اُس کے دعوے کی تصدیق ہے۔ درحقیقت معجزہ نبی کے دعوے کی عملی تصدیق

ہوتی ہے۔ اور اللہ چونکہ جھوٹی تصدیق نہیں کر سکتا۔ لہذا نبی کا دعوے معجزے کے ظہور کے بعد سچا ثابت ہوجاتا ہے۔ اسی لئے ہم بلاخوف تردید یہ یقین رکھتے ہیں کہ خداوند قدوس جو کہ تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے کسی انسان کو یہ دسترس نہ دیگا۔ کہ وہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے ایسے خوارق عادات دکھلائے۔ کہ دنیا اس کے مقابلہ سے عاجز ٹھہرے۔ جس کا جی چاہے اب بھی اس ضابطہ کا امتحان کر دیکھے۔ ضرور ہے کہ خدا ایسے حالات پیدا کر دیگا کہ اس کی طرف سے جھوٹے کی عملی تصدیق نہ ہونے پائے۔

عملی تصدیق کی مثال آپ جلسوں میں دیکھتے ہیں۔ اور کونسلوں اور پارلیمنٹوں کا حال سنتے ہیں۔ کہ جب کسی مسئلہ پر کسی تجویز پر کسی انتخاب پر بحث ہوجاتی ہے تو ایک طرف سے محرک اپنی تحریک پاس کرانے کیلئے حضار کے سامنے بسط سے دلائل بیان کرتا ہے۔ اور دوسری طرف تردید کرنیوالا اس کے تردیدی دلائل مفصلاً سامنے رکھتا ہے۔ اس کد وکد کے بعد فیصلہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ رائے لی جائے جس کی صورت یہ ہے کہ ہاتھ اٹھوائے جاتے ہیں اور یہ ہی ہاتھ اٹھا دینا یا نہ اٹھانا اس ریزولیوشن کی تصدیق و تائید یا تکذیب و تردید کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ زبان ہلانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک شخص کی نسبت پبلک جلسہ میں رائے لی جاتی ہے۔ کہ آیا اس پر جمہور کو اعتماد ہے۔ اس پر ہاتھ اٹھا دیئے جاتے ہیں۔ یہ ہی علامت ہوتی ہے اس بات

کی کہ ان سب کی رائے اس شخص کے حق میں ہے۔ ہم دن رات میں سیکڑوں دفعہ اپنے ہاتھ اوپر کو اٹھاتے ہیں۔ اس کو کسی چیز کے ثابت کرنے یا نہ کرنے میں کوئی دخل نہیں۔ لیکن یہی ہمارا ہاتھوں کی وضع طبعی اور ہیئت اصلی کے خلاف اوپر کو اٹھا دینا جب کسی ریزولیوشن کی تسلیم وانکار یا کسی دعوی کی صحت وبطلان کی آزمائش کے موقعہ پر ہو تو کسی غبی سے غبی انسان کو بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اُسوقت ان کھڑے ہوئے ہاتھوں ہی کے شمار سے رایوں کا شمار کر لیا جاتا ہے۔ اور پھر بڑے نازک اور عظیم الشان مسائل کے فیصلے ہاتھ کی اس غیر طبعی حرکت پر بچون وچرا ہو جاتے ہیں۔ پس جس طرح ہاتھوں کا نیچے لٹکائے رکھنا آدمی کی عام عادت اور وضع طبعی کے موافق ہے۔ اور اوپر کو اُٹھانا کبھی کبھی خاص ضرورت ومصلحت سے ہوتا ہے۔ اور یہی غیر طبعی وضع جب کسی ریزولیوشن پر ووٹ لینے کے وقت اختیار کی جائے تو اس ریزولیوشن یا دعوے کی بیشک وشبہ تصدیق وتائید سمجھی جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ کا جو فعل سنن طبعیہ کے سلسلہ میں ظہور پذیر ہو وہ اُس کی عام سنت اور عادت کہلاتی ہے۔ اور جو اسباب سے علیحدہ ہو کر کسی خاص مصلحت اور حکمت کے اقتضاء سے ظاہر ہو۔ وہ خرق عادت ہے اور یہی خرق عادت جب کسی شخص کے دعوی نبوت اور تحدی کے بعد اُس سے یا اس کے کہنے کے موافق صادر ہو یہ معجزہ ہے

جو کہ من اللہ اس کے دعوے کی فعلی تصدیق ہے۔ اور میں کہہ چکا ہوں کہ حق تعالےٰ کسی جھوٹے کی قولاً یا فعلاً تصدیق نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہم کو ایسے مدعی کے دعوے میں شک کرنے کا کوئی حق نہیں۔

وحی کی تعریف اور ضرورت اللہ تعالےٰ کا خطاب کسی ایسے شخص سے جس کے دعوے نبوت کی تکذیب کیلئے کوئی صحیح علامت نہ پائی جاتی ہو۔ اس کا نام وحی ہے۔ وحی اصولی طور پر قریب قریب یکساں ہے۔ یعنی نفس فعل میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ کلی مشکک کے طور پر وحی کے مراتب اور درجات ہیں۔ جب سے دنیا پیدا کی گئی۔ اسی وقت سے بندوں کو ہدایت کی ضرورت ہے۔ یعنی انسان میں یہ معلوم کرنے کی ایک طبعی اور فطری خواہش ہے۔ کہ کن خیالات اور اعمال سے اُس کو اللہ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ جیسے کہ انسان کو بھوک لگتی ہے غذا کی خواہش میں مضطرب اور بیتاب ہو کر انتڑیاں سکڑنے لگتی ہیں۔ پیاس لگتی ہے۔ پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، زبان سوکھ جاتی ہے۔ جس طرح حق تعالےٰ نے فطری طور پر بندہ کو بھوک یا پیاس لگائی۔ اسی طرح ایک اور بھوک اور پیاس روحانی بھی لگادی ہے۔ جو وصول الی اللہ اور معرفت کی ہے اور یہ پیاس اور بھوک بھی فطری ہے۔ مذاہب اور امکنہ وازمنہ کا اختلاف اس فطرۃ پہ کوئی اثر نہیں ڈال سکا۔ مسلمان، آریہ، ہندو، عیسائی، یہود، مجوس ایک چیز کی تلاش میں ہیں۔ البتہ بعضوں کا راستہ غلط ہے

مگر مقصد ایک ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کی خواہش، سچائی کی تلاش، وصول الی اللہ، معرفت ربانی اور اللہ سے نزدیک ہونے کی تمنا ایک چیز ہے جو کہ انسان کیلئے فطری اور طبعی امور میں سے ہے

دہریہ کو کیوں نہیں ہوتی؟ | ہاں جب کبھی جیسا کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔ تو بھوک پیاس جیسے فطری اور طبعی امور بھی اُس سے کنارہ کر لیتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح وہ ملاحدہ جو کہ دنیا کی زندگی اور لذات میں محو ہو چکے ہیں۔ شاید اُن کو معرفت الٰہی کی بھوک اور روحانی پیاس نہیں رہی ہے۔ اور اسی لئے ایسے روحانی بیماروں کا وجود یا کسی خاص زمانہ یا مکان میں ایسی وبا کی کثرت ہمارے فطری ہونے کے دعوے کو مخدوش نہیں کر سکتی۔ پس جس طرح حق تعالیٰ نے ہمارے جسمانی امور فطریہ کا انتظام کیا ہے۔ ہماری بھوک کیلئے غلہ زمین سے اُگاتا ہے۔ پانی آسمان سے اتارتا ہے۔ ناممکن ہے کہ ہماری روحانی بھوک کے لئے کوئی انتظام نہ کرے۔ بلکہ اُس کی رحمت کاملہ سے یقین ہے۔ کہ جس طرح مادی حوائج و ضروریات کیلئے مادی سامان مہیا فرماتا ہے۔ اُس سے زائد روحانی ضروریات کیلئے روحانی سامان ضرور مہیا کریگا۔ ظاہری پیاس کے بجھانے کیلئے جس طرح اُس نے پانی کے چشمے پیدا کئے ہیں۔ اسی طرح روحانی پیاس کیلئے روحانی چشمے ہونے چاہئیں اور وہ چشمے وحی الٰہی کے صاف اور شیریں چشمے ہیں۔ اور اس بات کو آریہ سماج بھی مانتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے

کہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ سامان کرنا تھا۔ وہ ابتدائے آفرینش ہی میں کیا جا چکا ہے۔ پھر بار بار اس میں تغیر و تبدیل یا تجدید اور تدریج کی ضرورت نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی عادت تکوینیات میں یہ ہے کہ وہ اگرچہ تمام اشیاء کو دفعتہً پیدا کرنے پر قادر ہے۔ مگر بتدریج ہی پیدا کرتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝

اور کوئی چیز کیوں نہ ہو۔ اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں۔ اور ہم اس کو اتارتے ہیں۔ ایک معین اور جنچی تلی مقدار میں۔

ہر چیز کو دفعتہً پیدا کرنا خدا کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر ایسا نہیں کرتے۔ بلکہ درخت کا بیج ڈالو تو بتدریج ایک عرصہ کے بعد درخت بن جائے گا۔ زچین کا قربان ہوتا ہے۔ مہینے گزرتے ہیں، مختلف اطوار و ادوار میں۔ بہت سے حکموں میں تب بچہ بنتا ہے۔ گو یکدم بنانے پر قادر تھا۔ جس طرح تمام حیوانات کو پرلے کے بعد یکدم بناتا ہے۔ اور اس کو انہیں تکان بھی نہ ہوتا۔ لیکن عادت اس کے برخلاف ہے۔ اب اگر کہو گے کہ یہ عادت کیوں ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ مادہ میں استعداد ہی ایسی ہے۔ پھر اگر کہو کہ ایسی استعداد کیوں ہے؟ اس کا جواب گزر چکا ہے کہ ہر جگہ "کیوں" نہیں پوچھا جا سکتا۔ بلکہ آخر میں ایک موحد بھی کہے گا کہ اللہ کے علم محیط میں یہی قرین مصلحت تھا۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ اللہ کی عادت یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ بہت سی اشیاء کو بتدریج بناتا ہے۔

اور جن اشیاء کی نسبت ہم یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ شاید دفعتہً پیدا ہو گئی ہوں۔ جیسے چاند، سورج، ستارے وغیرہ۔ ان میں بھی باعتبار فیض رسانی اور دوسری اشیاء سے تعلق رکھنے کے تدریج اور تغیر و تجدید مشاہد ہے۔ پس ہمارا خیال یہ ہے کہ جسطرح وقتاً فوقتاً ضرورت پیش آنے پر اللہ تعالےٰ بارش نازل کرتا رہتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک ہی بارش ہمیشہ کی ضروریات کیلئے کافی ہو جائے پھر ضروری نہیں کہ ہر ایک بارش یکساں زمانہ تک کفایت کر سکے۔ کبھی دو چار دس دن کیلئے رو ک تھام ہو جاتی ہے، کبھی اتنی بارش ہوتی ہے۔ کہ کئی ماہ تک ضرورت نہیں رہتی۔ ٹھیک اسی طرح اقوام عالم کی ارواح و قلوب کی کھیتیوں کو ابھارنے اور سرسبز کرنے کیلئے بھی اللہ تعالیٰ وحی والہام کی بارش حسب ضروریات زمانہ اور حسب استعداد قلوب مختلف زمانوں میں کرتا رہا ہے۔ کبھی تو وحی الٰہی کی بارش ایسے زور و شور کی ہوئی کہ قرنوں تک اس کی تری زمین سے نہ گئی۔ اور کبھی تھوڑا سا ترشح کافی سمجھا گیا۔ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ۔ اسی طرح لگاتار چھوٹی بڑی بارشیں مختلف اقوام و ممالک پر ہوتی رہیں۔ اور ہر ایک نے چھوٹی یا بڑی میعاد تک زمین والوں کی روحانی کھیتیوں کو سیراب کیا۔ آخر ایک وقت آیا کہ خدا کی ساری زمین خشک دریا سا ہو گئی، ہدایت کے چشمے سوکھ گئے، چاروں طرف آگ برسنے لگی، بداعتقادیوں اور بداعمالیوں کی آندھیوں اور لوؤں نے تمام روحانی کھیتیوں کو جھلس ڈالا۔

اُس وقت بطحاء کے پہاڑوں سے ایک گھٹا اُٹھی جو آخر کار ساری دنیا پر چھا گئی۔ اور وحی الٰہی کی وہ موسلادھار اور عالمگیر بارش ہوئی۔ جس نے ایک مدت مدید تک دوسری بارش کی کوئی ضرورت باقی نہ چھوڑی۔ جب تک اس بارش کا کافی اثر باقی رہے گا۔ دوسری بارش نہ آئیگی۔ اسی بارش کے پانی سے جو بڑے بڑے تالابوں اور نہروں میں جمع ہو گیا ہے۔ وقتاً فوقتاً زمینوں کی آبپاشی ہوتی رہے گی۔ اور جب یہ پانی تمام ہو جائیگا۔ تو مخبرِ صادق کی خبر کے موافق یہ دنیا بھی ایک آخری سنبھالا لیکر داعی اجل کو لبیک کہیگی ؀

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّ بَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ وَفِي الْحَدِيْثِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَكَانَتْ

یا اُن منافقوں کا ایسا حال ہے جیسے آسمانی بارش کہ اس میں (کئی طرح کے) اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی۔ موت کے ڈر سے مارے کڑک کے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ منکروں کو گھیرے ہوئے ہے (کہ اس کی پکڑ سے کہیں نہیں نکل سکتے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو ہدایت اور علم دیکر مجھ کو خدا نے بھیجا ہے وہ ایک موسلادھار بارش کی طرح ہے جو خدا کی زمین پر برسی پھر زمین کا ایک عمدہ زرخیز حاصل قطعہ تھا جس نے بارش کے پانی کو قبول کر کے گھانس اور سبزہ اگایا۔ اور دوسرا قطعہ تھا جہاں

منها طائفة طيبة قبلت الماء فانبتت
الكلاء والعشب الكثير وكانت منها
اجادب امسكت الماء فنفع الله
بها الناس فشربوا وسقوا وزرعوا
واصاب منها طائفة اخرى انما
هي قيعان لا تمسك ماء ولا
تنبت كلاء فذلك مثل من فقه
في دين الله ونفعه ما بعثني الله
به فعلم وعلم ومثل من لم
يرفع بذلك راسا ولم يقبل
هدى الله الذي ارسلت به
متفق عليه

پیداوار تو کچھ نہیں ہوئی لیکن اُس نے پانی کو اپنے اندر روکے رکھا جس سے لوگ منتفع ہوئے یعنی انہوں نے خود پیا اور جانوروں کو پلایا اور کھیتوں کو سیراب کیا۔ ان دونوں کے سوا زمین کے ایک حصے پر بھی بارش کا پانی پہنچا جو چٹیل اور شور تھی کہ نہ تو وہاں پانی رکتا ہے اور نہ گھاس اور سبزہ اُگتا ہے۔ تو سمجھ لو کہ پہلی مثال ہے اُس شخص کی جس نے دین کی سمجھ حاصل کی اور جو چیز خدا نے مجھ کو دی تھی۔ اُس نے اُس کو نفع پہنچایا۔ اور اُس نے خود بھی وہ علم حاصل کیا۔ اور دوسروں کو بھی سکھلایا۔ اور آخری مثال ہے۔ اُس کی جس نے اس ہادی کی طرف گردن اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور نہ اُس ہدایت کو قبول کیا جسے دیکر میں بھیجا گیا تھا۔

وحی کا تدریجی اور غیر تدریجی ہونا دونوں امکان میں داخل ہیں لیکن تدریجی ہونا عادت الٰہی کے موافق ہے۔

پہلے گذر چکا ہے کہ وحی اور الہام کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو بتدریج ہو یا دفعۃً۔ پس ہمارے اصول کے موافق جب عدم محض سے دنیا کو پیدا کیا گیا۔ اور آریوں کے نزدیک جب پرلے کے بعد دنیا موجود ہوئی۔ اسی وقت سے آدمیوں کو الہام اور وحی کی ضرورت ہونی چاہیئے۔ اسلئے کہ ان کو

اب زندگی بسر کرنی ہے۔ اور معاش اور معاد کی درستی کے اسباب بہم پہنچانے ہیں۔ جو بجز ایک ملہمانہ تعلیم کے متصور نہیں۔ معرفتِ الٰہی کی روحانی پیاس جو کہ ایک فطری امر ہے۔ اور اپنے رب اور مالک حقیقی کو خوش رکھنے کی تمنا جس کا بیج بنی آدم کے قلوب میں ازل سے بکھیر دیا گیا ہے۔ شروع ہی سے ایک ایسے صاف، شیریں اور روح پرور چشمہ کی تلاش میں ہے۔ جو تشنگان رضا مولیٰ کو سیراب اور ان کی روحانی کھیتیوں کو سرسبز و شاداب کر سکے۔ چنانچہ حق جل و علا کی حکیمانہ رافت و رحمت ملاحظہ ہو کہ زمین کے آباد کرنیوالے نے ابھی تک زمین پر قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ کہ پروردگار حقیقی نے اُسے تمام ضروری چیزوں سے نام بنام واقف کر دیا۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا — اور آدم کو سب (چیزوں کے) نام بتا دیئے

بلاشبہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بڑے تعجب کی بات تھی۔ جس خدائے رحمٰن نے ہماری پیدائش سے پیشتر ہمارے مادی حوائج کا کافی انتظام کر دیا، زمین پیدا کی۔ جس پر ہم کو لبنا اور کاروبار کرنا تھا۔ اور اس کو ہر طرح کی غذاؤں اور اسباب زندگی کا ایک گودام بنا دیا۔ چشمے اور دریا جاری کر دیئے۔ کنوؤں میں پانی کا ذخیرہ محفوظ کر دیا۔ زندہ رہنے اور سانس لینے کیلئے تمام فضا میں ہوا پھیلا دی۔ آسمان کی مضبوط چھت میں کیسے درخشاں اور آنکھوں کی خیرہ کرنیوالی قندیلیں روشن کر دیں۔ غرض علویات اور سفلیات کا ایسا نظام قائم کیا۔ کہ اس خاک کے پتلہ کو اپنی ضروریات میں اس سے نفع اٹھانا آسان ہو۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ایسا مہربان خدا ہماری روحی اور

باطنی ضروریات کی طرف توجہ نہ فرماتا۔ اس نے ابتدائے آفرینش سے ہی ہدایت کے چشمے جاری کیئے، وحی والہام کی بارشیں وقتاً فوقتاً برسائیں۔ اور جب جس وقت جس جس طرح اُس کے علم ازلی میں مناسب تھا۔ روحانی زندگی کے سامان مہیا فرمائے پس اگر مختلف زمانوں میں مادی غذا کی تیاری کیلئے مختلف طرح کی بارشوں اور بادلوں کے ادل بدل پر ہم کوئی اعتراض نہیں کر سکتے۔ تو ہم کو اس کا بھی کچھ حق نہیں پہنچتا کہ ہم بہت سے انبیاء و مرسلین اور اُن کی شرائع کے ارسال و انزال پر کسی طرح کی حرف گیری کر سکیں۔ متعدد شرائع کے نزول میں جو تدریج و تغیر مرعی ہوتی ہے۔ وہ شخص اکبر (عالم) کے حق میں اس سے زائد نہیں۔ کہ ایک طبیب کسی بیمار کو کئی دن تک منضج پلانے کے بعد مسہل دینے لگے۔ یا تنقیہ خاص کے بعد تنقیہ عام کا مشورہ دے کوئی عقلمند بھی اس وقت یہ نہ کہیگا کہ طبیب کے منضج پلانے میں کچھ غلطی یا بھول چوک ہو گئی تھی۔ جس کی تلافی اس نے مسہل کے نسخہ سے کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طبیب دانا مریض کی ہر ایک حالت کے مناسب دوا تجویز کرتا ہے۔ ٹھیک اسیطرح سمجھ لو کہ وہ حکیم و علیم خدا بھی عالم کے مزاج اور تغیر احوال و عوارض کی رعایت سے کبھی جلد جلد اور کبھی بدیر اسکے حالات کے مناسب نسخہ بدلتا رہتا ہے۔ اور بعض اوقات کسی نسخہ کا استعمال بہت دیر تک قایم رکھتا ہے۔ کیونکہ مریض کے حالات کا تغیر اس نسخہ کے اجزا پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ یہ یاد

رکھنا چاہیئے کہ یہاں سوال امکان اور قدرت کا نہیں، بلکہ عادت آلٰہی کا ہے۔
اور یہ پہلے گذارش کیا جا چکا ہے۔ کہ عادت سے اس کے خلاف قدرت رکھنے کی
نفی نہیں ہوتی۔ وحی کے مراتب کی تدریج اور تفاوت کو آپ ایک اور مثال
سے بھی سمجھ سکتے ہیں پہلے یہ سمجھ لیجیئے۔ کہ جس طرح انسان کی ظاہری آنکھ
مبصرات کے دائرہ میں اسوقت اپنا فعل کر سکتی ہے۔ جب کہ اُس کے اندر
نور بصارت موجود ہو۔ اور مبصر (یعنی جس چیز کو دیکھنا ہے) وہ بھی کسی قسم
کی خارجی روشنی کے احاطہ میں ہو اگر اندرونی اور بیرونی روشنیوں میں سے
کوئی ایک بھی مفقود ہو جائے تو آنکھ کے لئے دیکھنا ناممکن ہے۔ ٹھیک
اسی طرح غیبیات اور امور معاد کا سمجھنا بھی دو روشنیوں پر موقوف ہے۔
ایک اندرونی جو عقل کی روشنی ہے دوسری بیرونی جس کو وحی کی روشنی سے
تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا عقلِ انسانی نہ تو بیکار ہی ہے۔ اور نہ نورِ وحی سے مستغنی
ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد لیل و نہار کے نظام پر غور کیجیئے۔ کہ شب میں جوں جوں
تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے تو ستاروں کی چمک میں بھی تیزی آتی جاتی ہے تاریک
کمروں میں لالٹین چراغ وغیرہ سے روشنی کا سامان کیا جاتا ہے۔ جن کو قدرت
کے فیض نے تاریک اوقات میں دنیا کے کاروبار جاری رہنے کے لئے میسر
کر دیا ہے۔ ستاروں سے جہازوں کے چلنے چلانے میں مدد ملتی ہے۔ اور
خشکی اور تری میں لوگ ان کے ذریعہ سے وقت اور سمت کی تعیین کرتے ہیں

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ٥ ﴾ اور لوگ ستاروں سے بھی راہ معلوم کرتے ہیں۔ گیس کے ہنڈوں اور بجلی کے قمقموں سے لوگوں کا کاروبار چلتا ہے۔ جب صبح ہوتی ہے اور سورج نکلتا ہے تو تمام مختلف روشنی کے سامان نابود ہو کر ہزاروں آلات روشنی کے بجائے تنہا ایک روشنی سورج کی کام دیتی ہے۔ قدرت یہ بھی کر سکتی تھی۔ کہ سورج کو ہمارے سر پر ہمیشہ کھڑا رکھتی۔ مگر ایسا نہ کیا جس کی مصالح اور حکمتوں کا احصار خدا ہی کر سکتا ہے۔ بہر حال اس سے اسقدر ضرور معلوم ہوا کہ ظاہری نور (روشنی) متدرج اور متفاوت ہو سکتی ہے۔ اور اس تدریج اور تفاوت کے باوجود ایک ایسا مرتبہ بھی آسکتا ہے۔ جو تمام مدارج کو ختم کر کے صرف ایک ہی درجہ کو باقی رکھے۔ جو کہ اپنے مستفیدین کو سب ستاروں اور چراغوں کی روشنی سے مستغنی کر دے اور سب چھوٹی بڑی روشنیاں اُسی ایک روشنی میں محو اور مدغم ہو جائیں۔ پس اگر روحانی نور یعنی وحی اور الہام خداوندی میں بھی تدریج ہو۔ اور آخر میں اس کا ایک درجہ ایسا بھی آجائے جس کے بعد کوئی درجہ باقی نہ رہے تو اس میں کیا تعجب ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہر ایک نبی صرف اپنی قوم کیطرف بھیجا جاتا تھا۔ لیکن میں تمام آدمیوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔

وحی میں باوجود اصولی اتفاق کے فروعی تفاوت

یہ بات فراموش نہ کی جائے کہ تمام انبیاء کے پاس اصول کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہوتی ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ

(لوگو!) اُسنے تمہارے دین کا وہی رستہ ٹھہرایا ہے جس (پر چلنے) کا اُس نے نوح کو حکم دیا تھا اور (اے پیغمبر) تمہاری طرف (بھی) ہم نے اسی رستہ کی وحی کی ہے اور اس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو (بھی) حکم دیا تھا کہ (اسی) دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

البتہ مختلف انبیاء اور اُن کی شرائع میں اصول کو بحالہا قائم رکھتے ہوئے ازمنہ اور امکنہ اور امزجہ کے اختلاف سے زوائد کا خفیف سا تغیر و تبدل ہو جاتا ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ انسانوں کی عام غذا ہمیشہ ایک قسم کی ہے۔ مثلاً روٹی یا چاول اور پانی لیکن زوائد اور فروع میں باعتبار اوقات و مواسم تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جاڑے میں سوہن حلوہ، گاجر اور انڈوں کا حلوہ۔ اور گرمی میں فرینی، فالودہ وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اسی اصول کے اتفاق اور زوائد کے اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ابوھم واحد وامھاتھم شتّٰی (یعنی انبیاء کرام کی مثال ان بھائیوں کی طرح ہے۔ جن کا باپ ایک اور والدہ مختلف ہوں)

نبوت خاصہ کے بعد نبوت عامہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ مختلف اقوام کی طرف مختلف نبی اور نذیر ہدایت کیلئے آئے	وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ	اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی کہ اسمیں کوئی ڈرانے والا نہ گذرا ہو

جو مختلف زمانوں میں اپنے منصب کے موافق رہنمائی کا فرض ادا کر کے چلے گئے۔ ان سب کے بعد ایک ہادی اعظم اور منذر عام آیا جو کہ تمام مخلوق کیلئے ہادی ہے۔

لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا } تاکہ تمام جہان کے (لوگوں کے) لئے (عذاب خدا) سے ڈرانے والا ہو

پس ضروری تھا کہ ایسے منذر عام کے پاس ایسی کتاب ہو جو کہ تمام لوگوں کی ہدایت اور عام اقوام عالم کی رہبری کیلئے ابدی طور پر ضامن اور متکفل ہو جائے۔ اس سے پہلے مفصلاً گذر چکا ہے۔ کہ خدائی کلام کو ہم خدائی کام کی طرح پہچان سکتے ہیں۔

قرآن کی جامعیت

آؤ! اس منذر عام کی اس کتاب کو دیکھیں جو قرآن کے نام سے معروف ہے۔ کہ آیا وہ خدا کا کلام ہو سکتا ہے۔ یا نہیں؟ جب تم اس کی تفتیش کرو گے تو تم کو اس کتاب میں تہذیب اخلاق، طریق تمدن و معاشرت، اصول حکومت و سیاست، ترقی روحانیت، تحصیل معرفت ربانی، تزکیۂ نفوس، تنویر قلوب۔ غرضیکہ وصول الی اللہ اور تنظیم و رفاہیت خلائق کے وہ تمام قواعد و سامان موجود نظر آئیں گے۔ جن سے کہ آفرینش عالم کی غرض پوری

ہوتی ہے اور جن کی ترتیب و تدوین کی ایک اُمی قوم کے امی فرد سے کبھی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ان تمام علوم و حکم کا تکفّل کرنے کی ساتھ جن کے بغیر مخلوق اور خالق کا تعلق صحیح طور پر قائم نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی مخلوق دوسری مخلوق کے حقوق کو پہچان سکتی ہے۔ اس کتاب کی غلغلہ انداز فصاحت و بلاغت، جامع و موثر اور دلربا طرزِ بیان، دریا کا سا تموّج اور روانی سہل ممتنع سلاست، اسالیب کلام کا تفنن اور اس کی لذت و حلاوت اور شہنشاہانہ شان و شکوہ۔ یہ سب چیزیں ایسی ہیں۔ جنہوں نے بڑی بلند آہنگی سے سارے جہان کو مقابلہ کا چیلنج دیدیا ہے جس وقت سے قرآن کے جمال جہاں آرا نے غیب کی نقاب الٹی، اور آدم کی اولاد کو اپنے سے روشناس کیا۔ اُس کا برابر یہی دعویٰ رہا کہ میں خدائے قدوس کا کلام ہوں۔ اور جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین اور خدا کے سورج جیسا سورج اور خدا کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے۔ اسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن بنانے سے بھی دنیا عاجز رہیگی۔ قرآن کے مٹانے کی لوگ سازشیں کریں گے، کمر گانٹھیں گے، مقابلہ کے جوش میں کٹ مریں گے، اپنی مدد کیلئے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیں گے، کوئی حیلہ کوئی تدبیر، کوئی داؤ پیچ اٹھا نہ رکھیں گے، اپنے آپ کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے۔ سارے نقصانات اور مصائب دو واہی کا تحمل ان کے لئے ممکن ہو گا۔ مگر

قرآن کی ایک چھوٹی سی سورۃ کا مثل بنا لانا ممکن نہ ہوگا۔

نبی امی اور اُس کا اعجاز پھر طرفہ یہ ہے کہ جو ہادی اس کتاب کو لایا۔ اُس نے کسی درسگاہ میں تعلیم پائی نہ کسی لائبریری کا مطالعہ کیا۔ نہ کسی اُستاذ اور معلم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور نہ اس کے گردوپیش ایسے بیش بہا تعلیمات کا کوئی مواد موجود تھا۔ بلکہ اُس کی اور اُس کی قوم کی وہ حالت تھی۔ جس کو قرآن نے یوں ادا کیا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ
رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا
مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

وہ (خدا) ہی تو ہے جس نے (عرب کے) جاہلوں میں اُن ہی
میں سے (محمد کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا (کہ وہ) ان کو خدا کی
آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو (کفر و شرک کی گندگی سے)
پاک صاف کرتے اور انکو کتاب (الٰہی) اور عقل (کی باتیں) سکھاتے
ہیں (اور) نہ (اس سے) پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں (مبتلا) تھے

نہ صرف یہ کہ قرآن نے اس کے اُمّی ہونے کا اشارہ کیا۔ بلکہ امی کا وصف اُس کے لئے بمنزلہ ایک ممتاز لقب کے استعمال فرمایا جس جگہ یہ فرمایا۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ
النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ
مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ

(ان سے) ہماری مراد (اس زمانہ کے) وہ اہل کتاب (ہیں) جو ہمارے ان
رسول نبی امی (محمد) کی پیروی کرتے ہیں جن (کی بشارت)
کو اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں

اور ایک موقع پر تو آپ کی نوشت و خواند کے متعلق اُن لوگوں کے مجمع میں جن

آپ کی چہل سالہ طویل زندگی کا کوئی ممتد واقعہ خصوصاً وہ کہ جس میں احتیاج غیروں کی ہو مستور نہ رہ سکتا تھا، صاف صاف اعلان کر دیا گیا۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْ مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝	نہ تو تم قرآن سے پہلے کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے۔ اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو بیشک باطل پرستوں کو کچھ شک شبہ کی گنجائش ہوتی

یہی نہیں کہ آپ رسمی نوشت وخواند سے بالکل الگ تھلگ رہے، بلکہ جو چیز بڑے سے بڑے متعصب و معاند کو بھی محو حیرت بنا دینے والی ہے وہ یہ ہے۔ کہ آپ باوجود عرب کے نہایت ہی واجب التعظیم معزز و ممتاز خاندان میں سے ہونے کے اس فن شاعری سے بھی نا آشنا رہے جس میں اُس سر زمین کے بچے اور بچھو کریاں بھی طبعی سلیقہ کے موافق ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایسے ملک کا جہاں کی زمین نباتات کی طرح شاعروں کو اگاتی تھی۔ ایسا مایۂ ناز فرزند شعر گوئی سے کوئی علاقہ نہ رکھے؟ ایک شعر بھی اس کا عرب کے دواوین میں موجود نہ ہو۔ کسی مشاعرہ میں ایک قصیدہ بھی اُس نے نہ پڑھا ہو جو یہی گمان کر لیا جائے کہ شاعری سے ترقی کرتے کرتے شاید وحی والہام کا دعویٰ کر دیا ہوگا۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ	اور ہم نے ان (پیغمبر محمدؐ) کو شاعری نہیں سکھائی اور شاعری ان (کی شان) کے لائق بھی نہیں۔

پھر لائے تو پورے چالیس سال بعد ایک ایسا کلام لائے جو نہ قصیدہ ہے نہ غزل ہے، نہ مرثیہ ہے، نہ اُس رنگ ڈھنگ کا کوئی کلام اُن کے یہاں موجود ہے، نہ اس طرح کی کوئی تصنیف وہاں پائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ آفتاب کی طرح مکانوں کو نہیں، دلوں کو روشن کرنیوالا کلام ہے۔ وہ حکمت ہے، علم ہے، شفا ہے۔ برہان ہے، نور ہے، قانون ہدایت ہے خلاصہ یہ کہ خدا کے علم سے روشن کی ہوئی مشعل ہے۔ جسے نہ کوئی ہوا کا جھونکا گل کرسکتا، نہ کوئی آندھی بجھا سکتی ہے۔ دنیا کے فصحا و بلغا نے اُس امی کی لائی ہوئی کتاب کے سامنے سپر ڈالدی۔ بڑے بڑے شاعر ایسے بہک گئے کہ جس آدمی نے مدۃ العمر ایک شعر نہیں کہا تھا۔ محض یہ کلام سن کر اُسے شاعر بتلانے لگے۔ اس کا خارق عادت اثر دیکھ کر سحر سے تعبیر کیا کہ یہی چیز اُن کے زعم میں تمام فوق العادۃ کارناموں کی حد تھی اور بعض اُن میں سے قرآن کی فصاحت کو سجدہ کرنے لگے۔ قرآن کے علوم و قوانین نے ساری دنیا کے قانون ردی کر دیئے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ حکمتوں اور تمدنوں کو پس پا کرکے اُن کی جگہ لیلی۔ اور آخر کار اُمیوں کی جماعت کو دنیا کے مدعیان حکمت و تہذیب کا معلم بنادیا۔

آپ کا امی ہونا تاریخ کی اجلی بدیہیات میں سے ہے۔	کیا آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد کوئی شخص یہ جرأت بلکہ حماقت کریگا

کہ آنحضرت صلعم کے امی ہونے کو یہ کہکر جھٹلانے لگے کہ شاید آپ نے بھی دنیا کے دوسرے مصنفین کی طرح مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھی ہونگی۔ کسی میاںجی کے پاس بیٹھے ہوں گے۔ کوئی کتب خانہ آپ کے مکان میں چھپا ہوگا ؟

میں کہتا ہوں کہ وہ آیات جن میں آپ کا امی ہونا بیان کیا گیا ہے۔ ایسی قوم کو سالہا سال تک شب و روز سنائی جاتی رہیں۔ جن کی گودوں میں آپ بچپن سے پلے تھے۔ اور آپ کی عمر کا کوئی معتدبہ عرصہ اُن کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا۔ لیکن ایسی شدید عداوت اور غیظ وغضب اور آپ کی تکذیب وتردید پر اسقدر حریص ہونے کے باوجود کسی ایک آدمی نے بھی یہ شہادت نہ دی کہ آپ نے فلاں مدرسہ میں تعلیم پائی ہے، یا فلاں اُستاد کی خدمت اور ملازمت میں آپ اتنی مدت تک رہے ہیں۔ اگر کوئی آواز بھی ایسی اُٹھی ہوتی تو ضرور آج تاریخ میں اس کا کچھ نشان ملتا۔ تاریخ کے صفحات جس طرح اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ اس سے زائد آپ کے دشمنوں اور بدنام کرنیوالوں کے لئے کشادہ تھے، بلکہ آغاز اسلام میں جب کہ چند مظلوم اشخاص کے سوا کوئی بھی حضرت (محمد) صلعم کا کلمہ پڑھنے والا نہ تھا۔ اور کفر وباطل کی ساری شیطانی طاقتیں آپ کے نام ونشان کو صفحۂ ہستی سے معاذاللہ مٹانے

میں مشغول تھیں۔ اُن کے لئے ایسا پروپیگنڈا پھیلانے کا بڑا وسیع میدان موجود تھا۔ اور وہ بخوبی اُس کی اشاعت اطراف واکناف میں کر سکتے تھے۔ کہ محمد (صلعم) معاذاللہ اپنے امی ثابت کرنے کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ انہوں نے فلاں کالج میں یا فلاں پروفیسر سے اتنے زمانہ تک رسمی تعلیم پائی ہے۔

پس جب کہ چودہ سو برس کی تاریخ کوئی ایسا بیان پیش کرنے سے خاموش ہے۔ تو تاریخ کی عزت پر ایک بڑا ہی ناپاک اور کمینہ حملہ ہوگا۔ کہ تعصب کے جوش میں محض اپنے توہمات کی بناء پر تاریخ کو جھوٹا ثابت کیا جائے اگر اسکندر رومی کی فاتحانہ ملک گیری، انوشیرواں کی عدل گستری، رستم کی شہرۂ آفاق طاقت و شجاعت، حاتم طائی کی فیاضی اور سخاوت کی تردید کر دی جائے تو غالباً تاریخ و روایت کا فن اسقدر بے اعتبار نہ ہوگا۔ جتنا کہ نبی عربی صلعم کے امی ہونے کی نفی سے ناقابل اعتبار ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسا واقعہ ہے۔ کہ جس کا تواتر قرآن کے تواتر کی برابر ہے۔ اس کا انکار صرف اس صورت میں ممکن ہوگا۔ کہ ایک آدمی یہ ہی دعویٰ کر بیٹھے کہ محمد صلعم نامی کوئی انسان عرب میں پیدا ہی نہیں ہوئے۔ نہ انہوں نے یہ قرآن پڑھ کر لوگوں کو سنایا۔ نہ دعوئے پیغمبری کیا۔ تو کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ محض قرآن یا حامل قرآن کی عداوت کے جوش میں گذشتہ تمام مشہور

ومتواتر واقعات کو بھی جھٹلانے لگیں۔ جس کا خمیازہ نہ صرف مذہب اسلام کو بلکہ دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں خصوصاً اس مذہب کو اٹھانا پڑیگا جس کا وجود تاریخی زمانہ سے بھی بہت پہلے کا بتلایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص قرآن کی ضد میں اس درجہ جہالت پر اتر آئیگا۔ کہ وہ نزول قرآن سے پہلے نبی امیؐ کا تعلیم یافتہ ہونا ثابت کرے۔ حالانکہ وہ مشہور ضدی اور متمرد افراد بھی جنہوں نے کوئی امکانی صورت تکذیب قرآن کی اٹھا نہ رکھی تھی۔ تنگ اور کھسیانے ہو کر اس سے زائد نہ کہہ سکے کہ اِنما یعلمہ بشرٌ (کوئی آدمی ان کو قرآن سکھلاجاتا ہے) ایسا کوئی حوالہ وہ بھی نہ دیسکے جس سے چالیس سال کی عمر تک ایک دن کیلئے بھی آپ کا کسی سے تعلیم پانا ثابت ہوتا بلکہ خود ان کا یہی قول اس کی دلیل ہے کہ رسول خدا صلعم کے امی ہونے کو وہ ایسی ناقابل انکار بداہت سمجھتے تھے۔ کہ قرآن کے علوم ومعارف کو آپ کے گذشتہ مشہور ومعروف اُمیۃ سے تطبیق دینا ان کیلئے ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ آپ کی جگہ کسی غیر معلوم بشر کو جو تعلیمیافتہ ہو اس قرآن کا اصل مصنف قرار دیتے تھے۔ اُسوقت شاید ان کو یہ خیال نہ رہا کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھلانیوالا بھی کوئی بشر ہی ہے تو کسی بشر کا مقابلہ کرنے اور اس کے کلام کا مثل لانے سے سارے جہان کی بشری اور غیر بشری طاقت عاجز نہیں رہ سکتی۔ بیشک قرآن

حضرت محمد صلعم کا کلام نہیں ہے اور نہ آپ کے پاس ایسی کتاب تیار کر لینے کا کوئی طبعی سامان موجود تھا - اور یہ بھی درست ہے کہ یہ قرآن ضرور آپ کو کسی اور نے پڑھایا ہے . لیکن وہ پڑھانے والا بشر نہیں تھا - بلکہ وہ رب کریم تھا . جو لا یعقل نطفہ اور منجمد خون کو صاحب عقل و شعور انسان بنا دیتا ہے -

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝	پڑھو (اے محمد صلعم) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے

وہ جس طرح اپنی ذات و صفات میں اور اپنے کام میں بے مثل اور یکتا ہے اسی طرح اپنے کلام میں بھی بینظیر و بے ہمتا ہے . مخلوق جس طرح اُس کے کام کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے اُسی طرح اُس کے کلام کا معارضہ کرنے سے مجبور ہے - قرآن کے لانیوالے نے بڑے زور سے تحدی کی ، ہر طرح لوگوں کو اس کلام کا مثل لانے کیلئے ابھارا ، غیرتیں دلائیں ، مقابلہ کیلئے بیدار کیا ، جھنجوڑ جھنجوڑ کر اُٹھایا اور ایک ذرا سی بات پر جو اُن کے زعم میں بہت ہی آسان اور سہل الحصول ہونا چاہیئے تھی ، اپنے کل دعاوی کے جھوٹ اور سچ ہونے کا فیصلہ چھوڑ دیا - لیکن مقابلہ کرنیوالوں نے لڑائیاں لڑیں حاملین قرآن کے مٹانے اور تباہ کرنے کی سازشیں کیں ، اُن کے ذلیل اور رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا ، تاہم یہ حوصلہ کسی کو نہ ہوسکا

کہ قرآن کی کسی چھوٹی سی سورۃ کے جواب میں چند جملے بنا کہ قرآن کے اس عظیم الشان دعوے کو غلط یا پست کر دیتا۔ (العیاذ باللہ)

قرآن نے کس طرح لوگوں کو عاجز کیا؟

جیسے ہم خدائی کاموں کو مصنوعات عالم میں غور کر کے باآسانی پہچان لیتے ہیں، اسی طرح خدا کے کلام کے مقابلہ میں بہت سے شعراء کے کلاموں اور دنیا کے بڑے بڑے بولنے والوں کے نتائج افکار کو، اُن کے شستہ اور مہذب بیانوں کو، غلغلہ انداز خطبوں کو، معرکۃ الآراء لکچروں کو، عرق ریزی سے لکھی ہوئی تالیفات کو، ادبی اور علمی مصنفات کو سامنے رکھ کر ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ کہ یہ خدائی کلام ہے، آدمیوں کا کلام نہیں۔ پس جس کلام کے متعلق یہ دعوی ہمارے سامنے آتا ہے کہ یہ خدائی کلام ہے۔ اُس میں ہم کو امور ذیل پر غور کرنا پڑیگا۔

خدائی کلام کے پرکھنے کی کسوٹی کیا ہے؟

(۱) مدعی نبوت جس کی زبان سے یہ ہم تک پہنچا۔ اُس کی کیسی حالت ہے؟

(۲) اُس کی تعلیم کیسی ہے؟

(۳) کیا اُس جیسا آدمی ایسا کلام بول سکتا ہے؟

(۴) کیا اُس کے پاس ایسا سامان موجود ہے۔ جس سے وہ ایسے بیش بہا علوم و مضامین ادا کر سکے؟

کیا حجاز میں کوئی علمی سامان موجود تھا؟

پہلے سوال کے متعلق قرآن کے لانیوالے کی حالت جب ہم دیکھتے ہیں۔ تو وہ ایک دیانتدار شریف النسب مگر ایک یتیم بچہ ہے۔ جس کے سر پہ نہ باپ نے سایہ کیا، نہ زیادہ دنوں تک آغوش مادری کی راحت اُٹھائی، نہ اُسکے پاس کوئی ثروت ہے، نہ دولت، نہ اُس کا گھرانہ کوئی علمی یا صنعتی گھرانہ ہے، نہ اُس کے پاس لڑکپن کے زمانہ یا جوانی بلکہ نبوت کے بعد بھی کوئی ظاہری علمی ساماں ہے، نہ کتب خانہ ہے، نہ اُس کے وطن میں کوئی مدرسہ ہے نہ کوئی مکتب، نہ اُس کے وطن میں علوم وفنون کا کسی قسم کا چرچا ہے، بلکہ وہاں کسی کے کان علوم وفنون کے چرچے سے آشنا بھی نہیں۔ ہاں اُن کے پاس اگر ہے تو صرف زبان ہے اور اس قدر طلاقت لسانی اور قادر الکلامی ہے کہ وہ تمام جہان کو اپنے سامنے گونگا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ عرب کے ماسوا کا جو نام عجم رکھا تھا۔ اُس کی بھی یہی وجہ تھی کہ عجم کو قادر الکلام نہیں سمجھتے تھے۔ اور اپنے مقابلہ میں سب کو ہیچ جانتے تھے۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں نہایت شان وشوکت کیساتھ بیدھڑک بولتے تھے۔ معمولی اونٹ اور بکریاں چرانے والے ایسا برجستہ کلام کہتے تھے کہ دوسروں کو بہت فکر وتامل کے بعد بھی ویسا کہنا مشکل تھا۔ چند جملوں میں جذبات کو برانگیختہ کر دیتے۔ جب بولتے تو رعد کی طرح گرجتے، بجلی کی طرح کڑکتے، بارش کی طرح برستے تھے۔ اور تھوڑی سی دیر

میں گھر بار اور گھر بار آتش کا سماں کھینچ دیتے تھے۔ غرض کہ لے دے کر اُن کے پاس اگر کوئی چیز تھی۔ تو صرف زبان تھی۔ ویسے کوئی طریقہ باقاعدہ تصنیف کا نہ تھا، درسگاہیں نہ تھی۔ کتب خانے اور لائبریریاں نہ تھیں۔

اب سوچو کہ اگر ایسے ملک میں کوئی ذہین اور صاحب ثروت بھی ہو تو کیا مختلف علوم وفنون کا سیکھنا اُس کیلئے عادۃً محال نہ ہو گا۔ پھر جب اُس کے ساتھ دوسرے قدرتی اسباب بھی ایسے جمع ہوں جن کے ہوتے ہوئے سیدھی سادی زندگی بسر کرنا اور معمولی کفاف بھی مہیا کرنا مشکل ہو جائے۔ جیسا کہ ولادت سے پہلے والد کا انتقال اور بحالت رضاعت والدہ کی وفات، پھر چچا کی پرورش میں چلے جانا۔ اور اسی طرح چالیس برس کی عمر کو بے سروسامانی میں بسر کرنا، کبھی قلم کو ہاتھ بھی نہ لگانا۔ نہ کسی اُستاد کے سامنے کتاب کھولنا، ان سب علامتوں کو دیکھ کر عادۃ اللہ (جس کو آج کل کے لوگ قانون قدرت بھی کہتے ہیں) یہ بھی بتلاتی ہے کہ ایسا شخص ابواب تہذیب و تمدن اور معارف آلہیہ اور حقائق، توحید ذاتی وصفاتی وافعالی اور علوم ہدایت امم واقوام میں کوئی سیدھی بات بھی نہ کر سکے، چہ جائیکہ وہ ایسی کتاب لاجواب اور ایسی آیات بینات لوگوں کے سامنے پیش کرے جس کو دیکھ کر ارباب فنون اور علماء متبحرین حیران رہ جائیں، بلکہ دُنیا کے بڑے بڑے عقلاء اور حکماء اس کی چوکھٹ پر سر دُھننے لگیں، اور جن وانس اس کا مثل پیش کرنے سے صریحاً عاجز و درماندہ ہو جائیں۔ جب ایسے حالات

میں ایسا کلام ہم دیکھیں گے تو ضرور اس کو خدائی کلام کہنے پر از روئے عقل
و انصاف و تجربہ مجبور ہوں گے۔ دوسرا سوال بھی مذکورہ بالا بیان سے حل ہو
گیا کہ جب ملکی اور قدرتی حالات ایسے ہوں جن کے ہوتے ہوئے ایک فارغ البال
اور خوش حال آدمی بھی اکتساب علوم اور تحصیل فنون سے عاجز ہو تو ایک بے سرو
سامان کیلئے ایسی اعلیٰ تعلیم کہاں میسر ہو سکتی تھی۔ آپ کی سوانح سب کو معلوم
ہے کہ طفولیت ہی میں یتیم ہوئے اور ہوش سنبھالنے کے بعد بعض ابواب معیشت
اور دیگر افکار میں مبتلا ہو گئے۔ ہاں پیدائشی طور پہ جو بہت ہی شدید اور
قوی داعیہ طلب حق اور معرفت الہیہ کا آپ کے قلب مبارک میں موجزن تھا۔
اور جو سخت نفرت اور بغض آپ کو فطری طور پہ رسوم شرکیہ اور فحشا و منکرات
سے تھی۔ وہ آپ کو تبتل (انقطاع خلائق) اور یکسوئی اور عزلت گزینی کی طرف
مائل کرتی تھی۔ چنانچہ کبھی کبھی آپ کئی کئی دن تک تمام انسانوں کے جوار سے
علیحدہ ہو کر غاروں اور پہاڑوں میں خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کو یاد کرتے
اور اپنے کانشنس کے موافق اس کی عبادت کیا کرتے تھے، جہاں انسان
کا گزر تو کیا، کوئی پرندہ بھی پر نہ مارتا تھا۔

تاریخ کی نہایت ہی معتبر اور محفوظ روایتیں جن سے بڑھ کر کوئی وثوق
کی چیز تاریخ کے خزانہ میں نہیں مل سکتی، تبلاتی ہیں کہ آپ حرا کی چوٹی پہ
(جسے آج کل جبل النور کہتے ہیں) کئی کئی دن تنہا رہ کر اس وحدہٗ لاشریک

کی معرفت کی طرف قدم اٹھاتے تھے۔ کوئی شخص ان چند ایام خلوت میں بھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ آپ کے پاس خفیہ طور پر کوئی معلم جاتا تھا۔ اور وہ آپ کو کتاب پڑھاتا تھا۔ ایسے حالات میں نزول قرآن سے پہلے آپ کے تعلیم یافتہ ہونے کا ادعا کسقدر بے دلیل بات ہے۔ قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا ہ۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْ مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝	قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھتا تھا۔ نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو البتہ اہل باطل شبہہ میں پڑتے ۔

نبوت سے پہلے ایک دفعہ بچپن میں اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ اور ایک مرتبہ جوانی میں دوسرے رفقاء کے ساتھ آپ کو شام کی طرف بغرض تجارت چند روز کے لئے سفر کا اتفاق ہوا۔ بحیرا راہب نے اسی سفر میں آپ کو دیکھا اور آثار رشد و صلاح اور علامات نبوت دیکھکر حضور کے تابناک مستقبل کے متعلق کچھ پیشین گوئی بھی کی۔ لیکن جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے، پڑھنا پڑھانا تو درکنار، کوئی شخص تاریخ سے ایک شہادت بھی اس بات کی پیش نہیں کر سکتا۔ کہ اس چند ساعت کی صحبت میں آپ نے ایک کلمہ اور ایک حرف بھی بحیرا یا کسی اور راہب یا قسیس سے سیکھا ہو۔ اور اگر بالفرض ایسا ہوتا تو سب سے پہلے قافلہ والوں کو اور بحیرا کے متبعین کو اس کی خبر ہوتی۔ اور وہ بڑے زور شور سے اپنی تاریخوں میں درج کرتے کہ محمد معاذ اللہ فلاں راہب کے شاگرد ہیں۔ حالانکہ صفحات میں

اس کا کوئی نشان موجود نہیں۔

تیسرے سوال کے متعلق یہ کہنا ہے کہ اگر مدعی الہام ایسا ہو کہ اس نے باقاعدہ علوم و فنون کو حاصل کیا ہو۔ اور اپنی سادہ زندگی میں اس کی فصاحت اور علمی قابلیت بھی مشہور ہو چکی ہو۔ اور اس کے پاس ایسا سامان بھی موجود ہو جس کی وجہ سے وہ تصنیف و تالیف پر قادر ہو جائے۔ لبعدہٗ وہ ایک نفیس کتاب لکھ کر اس کے الہامی ہونے کا دعویٰ کر دے تو شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

کیا فیضی کی تفسیر اور سعدی کی گلستان معجزہ ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ قرآن کے مقابلہ میں بعض خوش فہم فیضی کی بے نقط تفسیر اور سعدی کی گلستان کو پیش کر کے یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ جس طرح ان دونوں کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا، اسی طرح اگر قرآن کا جواب بھی کسی نے نہ دیا۔ تو وہ معجزہ کیونکر ہو سکیگا۔ اور اگر وہ معجزہ ہے تو فیضی کی بے نقط تفسیر اور سعدیؒ کی گلستاں بھی معجزہ ہو گی۔

حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ سعدی اور فیضی دونوں کے پاس سامان تعلیم و تالیف کسقدر موجود تھا۔ کتنے عرصہ تک انہوں نے تعلیم حاصل کی، برسوں مدرسوں میں پڑے رہے، راتوں جاگے، مدتوں محنتیں کیں۔ سالہا سال کی محنتوں اور دماغ سوزیوں کے لبعد اگر بالفرض فیضی یا حریری یا متنبی یا کوئی اور عربی میں، سعدی فارسی میں، ملٹن انگریزی میں، یا ہومر یونانی میں، یا

کالی داس سنسکرت میں ایسے ہوئے کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہو گیا تو کوئی تعجب کی جگہ نہیں۔

خدا کے کلام معجز کی تعریف میں میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ اسباب متعارفہ کے توسط کے بدون صادر ہونا چاہیئے۔ کیا ان لوگوں کی باقاعدہ تحصیل علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت و ہمنشینی، وسیع مطالعہ، مدتوں کی مشاقی اور پھر کیا ان کے جاننے والوں سے مخفی ہے؟ اور کیا فائق کلام یا تفسیر لکھنے کیلئے یہ ظاہری اسباب نہیں ہیں؟ اگر ہیں اور ضرور ہیں تو ان کے کلام کا فائق ہونا بلا سبب متعارف کے ظاہر نہ ہوا بلکہ اتنی خاک چھاننے اور مصیبت بھگتنے کے بعد اگر ان کا کلام ایسا نہ ہوتا تو خلاف عادت ہونیکی وجہ سے موجب تعجب ہو سکتا تھا۔ لہذا فیضی کی تفسیر کا ایک خاص صنعت یعنی بے نقط ہونے میں تفوق محل تعجب نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ جس نے کتاب اور کاغذ، قلم، دوات کو چالیس برس تک ہاتھ نہ لگایا۔ نہ کسی درسگاہ میں قدم رکھا، اُس نے وہ کتاب دنیا کے سامنے پیش کی کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اُس کے اوپر قربان ہو جانا اپنا فخر سمجھے اور سمجھتے ہیں۔ اور سمجھتے رہیں گے۔ بلکہ وہ اور اُن سے زیادہ باکمال ہستیاں اپنی ہستی اور کمالات کا سرچشمہ بھی اسی نور مجسم اور اسی کتاب مقدس کو سمجھتے ہیں۔ دیکھو خود حضرت سعدی بوستاں کے دیباچہ میں قرآن لانیوالے پیغمبر صلعم کی نسبت کیا فرماتے ہیں ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
مپندار سعدی کہ راہِ صفا — تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ
کلیمے کہ چرخِ فلک طور اوست — ہمہ نورہا پرتوِ نورِ اوست
یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست — کتب خانۂ چند ملت بشست
بلندِ آسمان پیشِ قدرت خجل — تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل
تو اصلِ وجود آمدی از نخست — دگر ہرچہ موجود شد فرع تست
ندانم کدامیں سخن گو یمت — کہ والاتری زانچہ من گو یمت
ترا عز لولاک تمکیں بس است — ثنائے تو طٰہٰ و یٰسین بس ست
چہ وصفت کند سعدی ناتمام — علیک الصلوٰۃ ای نبی والسلام

اور فیضی جس کو قرآن کے مخالف بطور ایک غیر مجروح گواہ کے پیش کرتے ہیں اپنی تفسیر کی ابتداء میں اس نبی امی کی کتاب کو خدائی کلام مانتے ہوئے اور اس کے سامنے تمام علوم و کتب کو (خواہ فیضی کی ہوں یا سعدی کی) ہیچ بلکہ محض دردسر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے۔

العلوم کلھا صداع الا علم کلام اللہ و کلام اللہ لا عد لمحامدہٖ ولا حد لمکارمہٖ ولا حصر لسواطعہٖ ولا احصاء لعلومہٖ وما علوم	کلام اللہ کی معلومات کے علاوہ تمام علوم دردسر ہیں اور کلام اللہ کے محامد کی کوئی تعداد نہیں نہ اس کے مناقب کی کوئی انتہا ہے اسکی صداقتوں کی نشان غیر محصور اور اس کے علوم بیشمار ہیں۔ جو علوم

كلام الله كلها احدٌ الا الله و رسوله و اولوا العلم ما علموا الا اعدادا۔

کلام اللہ میں موجود ہیں۔ اُن سب پر سوائے خدا اور اُسکے رسولؐ کسی کا احاطہ نہیں۔ تمام اہل علم کو جو کچھ ہاتھ آیا وہ ایک محدود حصہ ہے۔

پس جب فیضی اور سعدی بھی خود اپنے اقرار کے موافق اس نبی امی صلعم کے دلبستان علم وحکمت میں ایسے ہیں جیسا کہ ایک شیر خوار بچہ سمندر کے کنارہ پر لیٹا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ جس کے ہاتھوں کو کبھی کبھی ایک آدھ بوند پانی کی لگ جاتی ہو تو اب سعدی کی گلستاں یا فیضی کے کلام کو کلام اللہ کے مقابل لانا نہ صرف فیضی اور سعدی کا استہزاء اور شاہد کی ضمیر کے خلاف شہادت دلانا ہے۔ بلکہ حد درجہ کی بے حیائی سے مدعی سُست اور گواہ چست کے طور پر اپنے آپ کو ذلیل اور رسوا کرنا ہے۔ علاوہ اسکے ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ کیا فیضی اور سعدی نے یہ آواز بھی لگائی تھی۔ کہ تمام دنیا ملکر میری کتاب کی کلاًّ یا جزءً مثال پیش کرے اور کیا پھر یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ ہرگز پیش نہ کر سکے گی۔ کیا اُنہوں نے کسی ایک آدمی کو بھی اپنے مقابلہ کیلئے اُبھارا، عار دلائی، مجبور کیا کہ وہ ناچار سامنے آئیں۔ اور ایسے سامان مہیا کئے کہ ان کو خواہی نخواہی کشاں کشاں سامنے آنا پڑتا۔ اور وہ مجبور ہوتے کہ فیضی اور سعدی کے کلاموں کا معارضہ کریں۔ اور فرض کرو کہ سعدی وغیرہ تحدی اور مبارزہ بھی کرتے اس پر بھی کوئی میدان میں نہ آتا۔ تو یہ بھی عجز کی دلیل نہیں

ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ممکن تھا کہ دنیا ان کا مقابلہ کرنے میں کوئی عظیم نفع، یا نہ کرنے میں کوئی عظیم نقصان نہ سمجھتی اور اس لئے اس دعوے سے بے التفاتی اور استغناء برتتی۔ مگر برخلاف اس کے قرآن نے شروع ہی سے دعویٰ کیا کہ میرا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ غیرت دلائی جھنجوڑ جھنجوڑ کر اٹھایا، چابک مار مار کر معارضہ کیلئے کھڑا کیا۔

مقابلہ کا پرزور چیلنج

اور کہا کہ میرے جیسی ایک چھوٹی سی سورت سب مل کر بنا لاؤ اور اسی پر فیصلہ ہے۔ اگر نہ لاسکو اور ہمارا دعوےٰ یہ بھی ہے کہ کبھی نہ لاسکو گے تو پھر مجھے خدا کا کلام تسلیم کرو۔ ورنہ اس ابدی عذاب سے ڈرو جو منکرین کیلئے تیار ہے۔ اب دیکھئے کہ چیلنج کس زور کا تھا۔ اور کتنے بھاری نفع یا نقصان کا سودا تھا۔ کیا ایسی حالت میں کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ لوگوں نے توجہ نہ کی ہوگی یا پوری ہمت اور قوت سے مقابلہ کیلئے نہ نکلے ہوں گے۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ پوری توجہ اور پورا اعتناء کیا گیا۔ کیسے کہا جائے کہ توجہ نہ کی گئی ہوگی جب کہ آپ کے پیچھے پیچھے آدمی دوڑتا تھا۔ کہ اے لوگو یہ مجنوں ہے، اس کی بات نہ سنو۔ تاکہ آپ کا اثر کہیں جمنے نہ پاوے۔ آپ کی ہلاکت کی کوشش کی گئی آپ پر ہر قسم کے حملے کئے گئے۔ آپ کے قاتل کے لئے بڑے بڑے انعاموں کا اعلان ہوا۔ وہ جب آپ کا اثر برق رفتاری سے بڑھتا گیا اور آپکی صداقت وحقانیت و درجہ استقامت کو دیکھ کر ہزارہا نفوس آپ کے گرویدہ ہو گئے اور آپکے حریفوں کے خاص خاص لوگ بھی ان سے ٹوٹ ٹوٹ کر آپکے حلقہ بگوش

غلام بن گئے ۔خاندان کے خاندان داخل اسلام ہونے لگے ۔بعض بڑے بڑے متمول اور معزز لوگ عیش و عشرت چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچے ۔ پیارے پیارے بچوں اور عورتوں کو خیر باد کہکر فقیرانہ حالت میں نہایت بے سرو سامانی کے ساتھ آپکے قدموں پر آپڑے اور ایسی سخت کٹھن اور خطرناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے کہ بشر سے اس کا تحمل سخت دشوار تھا ۔ تو آپ کے مخالفوں نے غیظ و غضب سے بیتاب ہو کر جنگ وجدال اور معرکہ آرائی شروع کر دی ۔ تلواریں اُٹھائی گئیں صف آرائیاں ہوئیں، خون کی ندیاں بہائیں، جانیں گنوادیں، خویشوں اور عزیزوں کے سر کٹوائے، مال و متاع کو برباد کیا ۔ تاکہ کسی نہ کسی طرح محمد صلعم کو مغلوب کرلیں، ادھر سے بہت سہل و آسان طریقہ مغلوب بلکہ اثر کے کلیتہً معدوم کرنیکا یہ بتایا گیا کہ صرف تین آیت کی برابر ایک چھوٹی سی سورت اسی شان کی لے آؤ ۔جس شان میں قرآن تمہارے سامنے ہے ۔ تو ہم خود بخود تمام تحریک کو ختم کر کے اپنی جماعت بلکہ اپنے آپ کو بھی تمہارے حوالہ کر دیں گے ۔ پھر مقابلہ کی اس آسان اور سہل ترین تدبیر کیساتھ اور بھی رنگارنگ سہولتیں، بلکہ ہر ممکن آسانی بھی اُن کیلئے بہم پہنچا دی ۔ چنانچہ جب چیلنج دیا تو یہ نہ کہا کہ حضرت محمد صلعم کے مقابلہ میں ان جیسے ایک امی کو منتخب کرو ۔ بلکہ سب کے سب بلکہ جتنے فصیح و بلیغ تعلیمیافتہ قبائل ہیں ۔سب جمع ہو جاؤ ۔ اتنے پر بھی بس نہیں، تمام دنیا کے انسانوں کو بھی جمع کر لو، بلکہ انسانوں کیساتھ دوسری مخلوق کو بھی شامل کر کے

ایک سورۃ بنالاؤ تو نہ تلوار اٹھانے کی ضرورت ہوگی، نہ خون بہانے کی حاجت باقی رہے گی نہ سلطنتیں اور سرداریاں تباہ ہونگی، نہ سازشیں کرنا پڑیں گی۔ اور ساری تدابیر اسی ایک سہل بات پر ختم ہو جائینگی۔ پہلے گذر چکا ہے کہ وہ اسقدر بولنے والے تھے کہ بولنے میں اور زبان کی فصاحت میں اپنے سوا تمام دنیا کو گونگا کہتے تھے۔ جو صاف دلیل ہے۔ کہ اُن کے پاس مقابلہ کے لیئے اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز آسان اور سہل نہ تھی۔ مگر اُن کی زبانیں گنگ ہوگئیں، دماغ مفلوج ہوگئے، جوارح معطل ہوگئے، لیکن اس سہل ترین اور فیصلہ کن مقابلہ کی تاب نہ لا سکے۔

لقلنا مثل ھذا کا جواب | کبھی زبان سے یہ بھی کہتے تھے کہ:۔

لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا — اگر ہم چاہتے تو اُس جیسا کلام کہدیتے۔

یعنی نہ ہم نے چاہا نہ کہا۔ مگر کیوں نہ چاہا؟ اس لیئے کہ اپنی عزت اور آبرو اور قرآن کے سامنے اپنے عجز اور کمزوری کی پردہ پوشی صرف اسی صورت میں دیکھی۔ اگر وہ جھوٹ موٹ کہدیتے کہ یہ ہمارا کلام قرآن جیسا ہے تو کہنے والے کی زبان دانی اور فصاحت اور تصدیق کرنیوالوں کی سخن شناسی اور سخن فہمی پر ایسا سخت بدنما داغ لگتا کہ وہ کسی بزم سخن اور محفل ادب میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے اور دنیا ان کا تمسخر اڑاتی۔ اسوجہ سے یہ ہمت کسی نے نہیں کی بلکہ جب مضطر ہوئے تو یوں ٹالدیا کہ اگر ہم چاہتے تو کہدیتے مگر ہم نے چاہا

ہی نہیں، لیکن اس کا فیصلہ ہر عاقل خود بخود سابقہ واقعات کو ملحوظ رکھ کر کر سکتا ہے۔ کہ کیا انہوں نے چاہا یا نہیں چاہا۔

بھائیو! کیا یہ ممکن ہے کہ خود تمام مصیبتیں برداشت کریں اور دوسروں کو بھی ہر ایک مصیبت میں ڈالیں، قرآن پڑھنے والوں کے خلاف بادشاہوں کے پاس جا کر مدد مانگیں، ہر قسم کی سازشیں کریں، لوگوں کو قرآن سننے سے روکیں اور خود اقرار کریں کہ اس آواز سے ہماری عورتیں اور بچے مفتون ہوئے جاتے ہیں۔ قرآن ان کے مذہبوں پر ایسی کاری ضرب لگائے، ان کی سٹریوں کو خاک میں ملادے، ان کے کبر و نخوت کے طلسم کو توڑ دے، ان کے معبودوں کی حکومت میں زلزلہ ڈال دے، ان کے جتھے توڑ ڈالے، ان کی قوتیں پراگندہ کر ڈالے، بھائی کو بھائی سے، باپ کو بیٹے سے، میاں کو بیوی سے، دوست کو دوست سے۔ غرض آدمی کو کل محبوب چیزوں سے چھڑا کر صرف اپنا ہی دالہ و شیدا بنالے۔ مگر وہ برق زبانی اور شیوا بیانیوں کے مدعی زبانیں سی کر اور لبوں کو بند کر کے چپ بیٹھے رہیں۔ اور باوجود ایسے عذب البیان اور قادر الکلام ہونے کے دو چار جملے بنانے کی خواہش بھی نہ کریں۔ بیشک ہزیمت خوردہ اور درماندہ آدمی بدحواس ہو کر ایسا ہی کہا کرتا ہے۔

قرآن کسی ایک آدمی یا کمیٹی کا بنایا ہوا کلام نہیں

جب کوئی بات نہ بن پڑتی تھی اور قرآن کے علوم کو محمد امی صلعم کے حالات سے

تطبیق نہ دیکھتے تو کہتے انما یعلمہ بشرٌ محمد صلعم کو قرآن کوئی دوسرا آدمی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہ اشارہ ایک شام کے نصرانی کی طرف تھا۔ اس کا جواب بھی قرآن نے ایسا دیا کہ دنیا پر واضح ہو گیا کہ یہ مقولہ بھی نہایت بے بسی کی حالت میں اُن سے صادر ہوا تھا

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ اَعْجَمِیٌّ وَّھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ۝	یعنی یہ لوگ کجروی سے جس شخص کیطرف قرآن کی نسبت کرتے ہیں اسکی زبان عجمی ہے اور یہاں ایک روشن اور فصیح زبان عربی کے مقابلہ کا چیلنج دیا جا رہا ہے

جس سے بڑے بڑے قریشی عرب جان چراتے ہیں۔ وہ عجمی غلام اُسے کیا جانے۔ کبھی کبھی بالکل ہی بدحواس ہو کر کہہ اُٹھتے تھے۔

اِنْ ھٰذَا اِلَّا اِفْکُ نِ افْتَرٰہُ وَ اَعَانَہٗ عَلَیْہِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۝	یہ قرآن اسکے سوا کچھ نہیں کہ (معاذاللہ) محمد صلعم کی اختراع (گھڑنت) ہے جسکی تصنیف میں دوسری جماعت اسکی مدد کی ہو

دیکھو! کسقدر مذبوحی حرکات ہیں۔ بیساختہ زبانوں سے نکل جاتا ہے کہ ایک انسان سے ایسا کلام ممکن نہیں کہ بن پڑے۔ ہو نہ ہو یہ کمیٹی کا کام ہو گا۔ اس کا جواب بھی مُسکت اور دندان شکن دیتے ہوئے فرمایا:۔

فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝ (یہ ایسا ظلم اور دن دہاڑے ایسا سفید جھوٹ۔

اگر بالفرض ہمارے پاس کمیٹی ہے تو تم اس سے زیادہ آدمیوں کی کمیٹی بنا سکتے ہو تم کو تو تمام جن و انس کی کمیٹی بنانے کی اجازت دی

چاہتی ہے۔ پھر جب تمام انسانوں کے جمع کرنے کی تم کو اجازت دی گئی تو تم بڑے دعوی کے ساتھ اس کمیٹی کے تمام افراد بھی اگر تمہیں معلوم ہوں مانگ لو جو تمہارے کہنے کے موافق ہمارے پاس ہے اس لئے کہ وہ بھی انسانوں میں داخل ہیں۔ جن کے جمع کرنے کی تم کو مہلت دی گئی ہے باوجود اسقدر وسعت اور آسانی بہم پہنچانے کے بھی اگر مقابلہ کلام ایزدی کا نہ کر سکے اور نہ کر سکو گے۔ اور یہ بھی مطالبہ نہ کیا کہ تم فلاں فلاں آدمی کو ہمارے ساتھ دیدو جن پر تم کو خیال ہے کہ وہ کمیٹی کے ارکان ہیں تو سمجھ لو کہ یہ محض شرارت اور ظلم اور دروغ بے فروغ ہوگا کہ قرآن کی تصنیف کسی مجہول الحال کمیٹی سے منسوب کرتے ہو۔

اس مقولہ کے جھوٹ ہونے کی اور ایک دلیل

پھر کیا کسی کمیٹی کا پنچایتی کلام ایسا ہو سکتا ہے۔ آپ نے بڑے بڑے فصیح البیان اور عمدہ بولنے والے بھی دیکھے ہونگے کیا کوئی ایسا پھر آپ کی نظر پڑتا ہے جو ہر ایک مضمون پر یکساں بولنے کی قدرت رکھ سکتا ہے۔ کوئی آدمی ہر مضمون کے بیان پر یکساں قدرت نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ بڑے بڑے قصیدوں میں دو چار اشعار منتخب ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ کسی متکلم کو ہر مضمون پر پوری قدرت نہیں ہوتی۔ چنانچہ علماء ادب کا اعتراف ہے کہ امرؤ القیس گھوڑوں کی تعریف اچھی کرتا ہے

نابغہ خوف و خشیہ میں، اعشیٰ شراب کی طلب اور تعریف میں، زہیر رغبت و رجا میں اچھا لکھتا ہے۔ جیسے نظامی و فردوسی رزم و بزم میں، سعدی وعظ و پند میں تفوق رکھتا ہے۔ لیکن دوسرے فن میں جاکر ان کی ساری جولانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

بوستاں میں ایک جگہ جنگ کی کہانی آگئی، وہیں سعدی کی زبان سست پڑ گئی۔ بوستاں کے پانچویں باب میں اس حکایت کو دیکھ لو۔ کہ نظامی اور فردوسی کے مقابلہ میں سعدی کا کلام کسقدر پھیکا ہے۔ کیونکہ رزمیہ کلام لکھنا سعدی کا فن نہیں تھا۔ کسی مشہور سے مشہور شاعر کا دیوان یا کسی مسلم سے مسلم عالم اور حکیم کی کتاب کیف ما اتفق اٹھا کر پڑھ جاؤ، اول سے آخر تک یکساں زور قائم نہیں رہ سکتا۔ قرآن کو اول سے آخر تک دیکھ لو کسقدر مضامین مختلفہ کی رو ہے، جو کہ نہایت روانی، سلاست، آب و تاب اور شان و شوکت سے بہ رہی ہے۔ اور ہر مضمون کو کسقدر قوت اور جزالت و فصاحت کیساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ کہیں معاش کا بیان ہے، نکاح و طلاق کے قواعد کی تعلیم ہے، کہیں فرائض میت تقسیم کی جاتی ہے، کبھی نماز و روزہ کا وعظ ہے۔ کبھی جہاد کا بیان ہے، لڑائی کے نقشے کھینچے جاتے ہیں۔ کہیں سنین ماضیہ کے تاریخی واقعات ہیں، کبھی دلوں کو رلانیوالی پند و نصائح بیان کی جاتی ہیں، کبھی بہشت کا

تنعم سامنے ہے کبھی دوزخ کا عذاب، یہ سب کچھ ہے، مگر طرزِ بیان میں کوئی سستی نہیں، کمزوری نہیں، انحطاط نہیں، ہر موقع پہ اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ اس کے مقابلہ سے تمام جن و بشر عاجز ہیں اور ہر جگہ زبان پر آتا ہے کہ ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست۔

اول سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی طرح کا زور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک ہی رنگ ڈھنگ اور رسالے کلام کی یہ یکسانیت ہی پتہ دے رہی ہے۔ کہ یہ کسی مخلوق کا، یا کسی کمیٹی کا کلام نہیں، بلکہ یہ اُس کا کلام ہے۔ جس کی صفات سب کی سب کامل، غیر متبدل، لازوال اور نقص و فتور سے منزہ ہیں:۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا	اور اگر (قرآن) خدا کے سوا کسی اور کے پاس سے آیا، ہوتا تو ضرور اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

پھر دیکھو اول سے آخر تک تمام مضامین نہایت خدائی کلام سے خدائی شان ٹپکتی ہے شوکت اور کبریا و عظمت بھرے الفاظ اور زوردار لہجہ میں ادا کئے گئے ہیں۔

اگر یہ کلام اُس بشر کا ہوتا جس کی زبان سے ہم تک پہنچا تو اس کی مظلومیت اور دشمنوں کی اُس پر پُرتکلف چڑھائیاں تو سب کو معلوم ہیں۔ ناممکن تھا۔ کہ اس کلام کے اندر کہیں نہ کہیں ظالموں کے سامنے تملق، خوشامد، مداہنت، بیچارگی اور مرعوب ہونے کے آثار موجود نہ ہوتے جن کا نام و نشان بھی قرآن میں

اول سے آخر تک موجود نہیں بلکہ جس زور و شور اور خدائی شوکت سے شروع ہوا وہ تنگی، اختتام اور زور کے ساتھ ختم بھی ہوا۔

ممکن ہے کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ شاید قرآن کی نظیر پیش کی گئی ہو مگر وہ باقی نہ رہی ہو

اگر کسی نے مقابلہ کیا ہوتا تو اس کا ضائع ہونا محال تھا

تو میں کہتا ہوں کہ ایک معلوم اور بے یار و مددگار کا کلام تو اب تک برابر موجود ہے مگر عرب کے بڑے بڑے رئیسوں بلکہ دنیا کے تمام باطل مذاہب والوں کی دلی تمنا جس کلام سے پوری ہو جاتی وہ باقی نہ رہے۔ کیا اسے عقل سلیم باور کر سکتی ہے؟ پھر جب کہ واقفوں کی تعداد سے مخالفوں کی تعداد کہیں زیادہ ہو۔ روئے زمین پر دشمن پھیلے پڑے ہوں جو ہر آن ایسی چیز کے تجسس میں آغاز اسلام سے آج تک رہے جو قرآن کے اس دعویٰ کو ٹھنڈا کر دے۔ مسیلمہ کذاب نے قرآن کے سامنے کچھ منہ چڑایا تھا۔ وہ تاریخ میں موجود ہے۔ باوجودیکہ وہ بہت زیادہ گندا، بیہودہ اور رکیک اور خلاف تہذیب کلام ہے۔ مگر وہ بھی اب تک باقی ہے۔ یعنی

الم تر ان اللہ [illegible] افواجا

[illegible]

مورخوں نے لکھا ہے [illegible] جب لبید نے [illegible] البتہ کلام کو بھی ضائع ہونے دیا۔ تو [illegible] تمام کو اور وہ بھی ایسا اچھا جو غرض محال قرآن

سے بھی اعلیٰ و برتر ہو کس طرح ضائع کیا جا سکتا تھا۔ اگر قرآن سے بہتر فصیح و بلیغ کلام ادبی لٹریچر سے گم ہو گیا۔ تو قرآن کا یہ دوسرا اعجاز ہوگا۔ کہ وہ اپنے سے غالب اور قوی کو بھی اس طرح فنا کر ڈالتا ہے کہ آج صفحہ ہستی پر کوئی اس کو زبان پر لانے والا بھی نہیں۔

عربی نہ جاننے والے کس طرح قرآن کی فصاحت کو پہچان سکتے ہیں؟

شاید کہو گے کہ ہم تو عربی نہیں جانتے ہماری سمجھ میں کس طرح قرآن کا اعجاز آئے؟ تو یاد رکھو کہ ہر فن میں اس کے اساتذہ اور ماہرین کے فیصلے کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر عربی زبان آج بھی زندہ زبان ہے سنسکرت کی طرح مردہ نہیں ہے بیروت ، مصر ، قاہرہ وغیرہ میں اس وقت بھی بہت سے ایسے نصاریٰ اور یہود موجود ہیں۔ جن کے مقابلہ میں بڑے بڑے ادیب قلم نہیں اٹھا سکتے۔ انہوں نے عربی زبان میں عجیب و غریب کتابیں لکھی ہیں۔ عربی لغت تیار کی ہے۔ ہزاروں چھوٹے چھوٹے رسائل اور موٹی موٹی کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں۔ اگر تم نہیں جانتے تو جاؤ ان ہی سے کہو کہ ایک سورۃ قرآن کے جواب میں بنا کر دیدیں۔ وہ بھی اسلام کے دوست نہیں بلکہ تم سے بڑھ چڑھ کر اس کے دشمن ہیں ہر ممکن سعی سے وہ اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ حوصلہ آج تک نہ کسی فرد کو ہوا ۔ نہ کسی انجمن کو کہ قرآن کے چہاردہ صد سالہ چیلنج کو منظور کرتا وہ اسی میں اپنی لیاقت اور عزت سمجھتے ہیں۔ کہ اس طرف کا قصد نہ کریں۔ تم بھی

لاکھوں روپیہ شدھی سبھاؤں پر صرف کر رہے ہو۔ جس طرح عیسائی اپنے مشنوں پر کروڑوں روپیہ لگاتے ہیں۔ بغداد کی آریہ سماج کو لکھو کہ وہ وہاں کے مشنوں کو یہ مشورہ دے کہ سب ملکر قرآن کے جواب میں چند سطر لکھ کر شائع کر دیں مگر ہاں بعد میں ان کی فضیحت اور رسوائی کا ذمہ دار تم کو ہونا پڑیگا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی مضمون قرآن ہی سے لیلو اور اسیقدر مزایا اور لطائف کی رعایت کیساتھ اپنی عبارت میں اس کو ادا کرو جسقدر مزایا اور لطائف قرآن کی عبارت میں مرعی ہیں قرآن کے پیرو تم کو بتلادیں گے کہ چراغ مردہ کو نور آفتاب سے کیا نسبت ہے۔

دس سورۃ کا مقابلہ | نزول قرآن کے وقت بعض لوگوں نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ یہ سب مخترعات ہیں

وَیَقُوْلُوْنَ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا

جواب یہ ہے کہ (قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ) اچھا اگر ہدایت کی باتیں نہ سہی تو تم بھی ایسی ہی مفتریات یعنی گھڑی ہوئی باتیں ایسے طرز بیان میں لے آؤ۔

محض ایک شاعرانہ مضمون کے ادا میں بھی بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک ہی خیال ہے جسکو شاعر ایک رنگ سے ادا کرتا ہے۔ دوسرا اسی میں ایسی لطافت پیدا کرتا ہے۔ کہ پہلے شاعر کا کلام اس کے سامنے ہیچ معلوم ہونے

لگتا ہے۔

ذوق ملک الشعرا ہے ایک غزل میں لکھتا ہے کہ

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا　　کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

اسی خیال کو دوسرا ایک شاعر مکند رام (جس کا نام بھی شاید کسی کو معلوم ہو) ایسی لطافت کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ کہ سخن شناسوں کو ناچار اسی کے حق میں فیصلہ دینا پڑا۔ کہتا ہے۔

دل کی نہیں تقصیر مکند آنکھیں ہیں ظالم　　یہ جا کے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

دیکھ لو ذوق کا کلام مکند رام کے مقابلہ میں کیسا پھیکا پڑ گیا ہے۔ اسی طرح فردوسی نے کہا تھا

جہاں را بلندی و پستی توئی　　ندانم چہ انچہ ہستی توئی

نظامی نے اس کے مقابلہ میں فرمایا:۔

پناہِ بلندی و پستی توئی　　ہمہ نیستند انچہ ہستی توئی

پہلے مصرع میں پناہ اور دوسرے میں نیستند نے نظامیؒ کے شعر کو فردوسی کے شعر سے بلیغ اور بہت صاف کر دیا ہے۔ فردوسی نے لکھا تھا۔

زہے بارگاہِ ز افراسیاب　　ز مشرق بمغرب کشیدہ طناب

نظامیؒ کہتے ہیں:۔

زہے بارگاہِ کہ چوں آفتاب　　ز مشرق بمغرب کشیدہ طناب

دیکھو چچا آفتاب نے شعر کو کیسا مبرہن اور لاجواب بنا دیا ہے اور ذرا قریبا ہے۔ کسی ذہنی ضرورت بھی نہ رہی۔ اُردو میں قمر کا شعر ہے

مرض ہجر مرا خاک ہوا اچھا تم سے　　خود مسیحا ہو جو اور ہیں بیمار آنکھیں

جوہر نے اس مضمون کو کسقدر خوبی سے ادا کیا ہے:

ہے اپنا درد بھی نہیں ہو سکتا　　کیسے عیسیٰ ہو کہ جب کھینچیں بیمار آنکھیں

آنکھوں کے ساتھ لفظ "کھینچ" دیکھنے کے قابل ہے۔ ناسخ کہتا ہے:-

شکل نظر نہیں جو بنایا انہیں پیام بھی　　عمر معنی کہ ایک ہی حالت چشم و گوش ہے

غالب نے اس کو کسقدر چست اور لطیف بنا دیا۔ کہتے ہیں:-

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال　　مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

ہزار لطف جہاں میں ہر ستم نہاں کیلئے　　ستم شریک ہوا کون آسماں کیلئے

کسی استاد نے اسی مضمون کو اسطرح لکھا ہے:-

جہت رخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں　　کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

سخن شناس سمجھتا ہے کہ دوسرا شعر اول سے باعتبار پاکی الفاظ و حسن اور خوبی ترکیب بالاتر ہے اور الفاظ معشوق و پردہ زنگاری نے اسکے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔ عزیز خاں لکھتے ہیں:-

خوب ہے اقبال بے رحم سے مانگا کس نے　　کہ فرشتے مجھے یاں داغ درم دیتے ہیں

اس کے مقابلہ میں ذوق کا کلام ملاحظہ ہو:-

کہتی تھی ہاں بھی رہاں کر دیں قضا　　داغ دیتے ہیں اُسے جسکو درم دیتے ہیں

ظاہر ہے کہ شعر اول میں داغ و درم دینا اور خوں بہا مانگنا محض دعا ہے اور دوسرے شعر میں داغ دینا اور صاحب ورم ہونا ثابت ہے۔ دیکھو یہاں داغ اور درم کا مضمون لیکر ایسی طرح ادا کیا کہ پہلے کی نسبت شعر نہایت بلیغ ہو گیا۔

یہ چند نمونے ہم نے اس لئے پیش کئے ہیں کہ یہ ثابت ہو سکے کہ بعض شاعرانہ تخیلات اور مفروضہ و مخترع مضامین کے ادا میں بھی ترکیب کی بندش اور الفاظ کی چستی اور روانی اور دیگر لطائف و مزایا کی رعایت سے کتنا فرق اور تفاوت ہو جاتا ہے۔ پس ہم اجازت دیتے ہیں کہ آج بھی سارے فصیح و بلیغ ملکر ایک دو قصے کہانیاں ہی ایسی عبارت میں پیش کر دیں جو قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت کے مقابلہ میں لطیف تر اور فصیح تر ہو۔ کیا اسقدر مہلتیں عطا کرنے کے بعد بھی اگر مقابلہ سے عاجز رہے تو یہ اس کی دلیل نہ ہوگی۔ کہ یہ کلام دنیا کے خالق اور مالک کا ہے۔

خدائی کام سے توحید اور خدائی کلام سے رسالت کا ثبوت

ہم نے کہا تھا کہ خدائی کام بندوں کے کام سے اس طرح ممتاز ہوتا ہے کہ بندوں کو اس جیسے کام پر کوئی دسترس نہیں ہوتی۔ اسی طرح اللہ کا کلام بھی بندوں کے کلام سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ کہ ویسا کلام بنانا بندوں کے اختیار اور قبضہ میں نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے ان دونوں مضامین پر ایک ہی آیت میں تنبیہ فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

تم کو اور تمہارے اسلاف کو اور تمہارے لئے زمین کا فرش، آسمان کی چھت اور بادلوں کی بارش، درختوں کے پھل جس پروردگار نے بنائے اُسی کی عبادت کرو۔ اور اس کا مثل مت قرار دو

یعنی جب خدا کے کاموں کا کوئی مثل نہیں لاسکتا تو خدا کو بھی بے مثل ماننا ضروری ہے۔ اسی طرح خدائی کلام کا مثل لانے سے جب سب عاجز ہوں تو اُس کو خدا ہی کا کلام یقین کرنا ضروری ہوا۔ اور اسی لئے جو بندہ اس کلام کو لایا ہے اس کی تصدیق بھی لازم ہوئی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر (قرآن) اُتارا ہے اگر تم کو اس میں شک ہو (اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اسی جیسی ایک سورۃ تم بھی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو (بھی) بلالو۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ خلجان رہے کہ خدائی کاموں کو ہم بظاہر کسی فاعل مختار سے صادر ہوتے نہیں دیکھتے بخلاف اس کے خدائی کلام کو ہم ایک ذی شعور اور

یا اختیار متکلم انسان کی زبان سے سنتے ہیں اسی لئے ہمارے لئے یہ ممکن ہوتا ہے۔ کہ وہ کلام خواہ کتنا ہی اعلیٰ وارفع ہو ہم اُسے متکلم کی طرف منسوب کر دیں جس کی زبان سے ہمارے کانوں تک پہنچ رہا ہے۔

لیکن اس کا یہ شبہ محض سطحی ہے۔ غور کیجیئے کہ اگر ایک چھ سات سال کا دیہاتی بچہ آپ کے سامنے آئے جس کو کسی نے گلستان یا بوستاں کا ایک باب، یا عرفی یا قاآنی کا ایک قصیدہ، یا حافظ شیرازی کی ایک غزل یا کسی اور بڑے عالم یا حکیم یا شاعر یا خطیب کا کوئی منتخب کلام یاد کرا دیا ہو۔ وہ آپ کے روبرو نہایت صاف و صحیح لب ولہجہ میں اُسے زبانی ادا کر دے اور فرض کرو کہ آپ کو یہ تعیین نہ ہو کہ اصل کلام کس کا ہے تو کیا واقعی اس صورت میں آپ محض اتنا دیکھ کر کہ یہ کلام اُسی بچہ کے کام و دہن سے نکل رہا ہے یہ یقین کر لیں گے کہ بیشک یہ کلام اُسی بچہ کا تصنیف کیا ہوا۔ اور اُسی کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ بچہ خود بھی کہہ رہا ہو کہ جناب یہ میرا کلام نہیں ہے۔ اور نہ میں ایسی قابلیت رکھتا ہوں۔ کہ ایسا کلام بنا سکوں اور اُس کے ساری بستی والے بھی موافق اور مخالف گواہ ہوں۔ کہ اس بچہ نے کبھی قبل ازیں ایسی اعلیٰ تعلیم اور صحبت نہیں پائی، جو ایسا کلام تصنیف کرنے پر قادر کر دے۔

کیا آپ ان سب حالات کی موجودگی میں بھی برابر یہی کہتے چلے جائیں گے

کہ نہیں یہ سب اسی کی تصنیف ہے کیونکہ بچہ تو ذی شعور با اختیار بولنے والا انسان ہے۔ اور اسی کے حلقوم سے ہم یہ آواز سن رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پرلے درجہ کا بلید، احمق، جاہل اور متعصب بھی اس کی جرأت نہ کریگا۔ تو ثابت ہوا کہ محض اسقدر دیکھ لینے سے کہ ایک کلام ایک شخص کے کام و دہن سے نکل رہا ہے یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کلام اسی کا ہے بخصوصاً جب کہ وہ اپنے سے نفی بھی کر رہا ہو۔ اور اس کا ایک جھوٹ بھی عمر بھر ثابت نہ ہوا ہو۔ اور اس کے حالات زندگی بھی نفی کی تائید کرتے ہوں اور خود اس شخص کے کلام کا بڑا بھاری ذخیرہ (احادیث) بھی محفوظ اور مدون ہو اور اس کلام کا کوئی حصہ باوجود غایت درجہ کی فصاحت و بلاغت کے اس کلام کے کسی حصہ کی ہمسری نہ کر سکتا ہو۔ اور ساری دنیا ویسا کلام پیش کرنے سے تھک چکی ہو۔ اندریں حالات آپ ہی فیصلہ کریں کہ ایک ایماندار طالب حق کو کیا یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ :-

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

لاریب اس کی یہی شان ہے :-

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى	(بلکہ یہ قرآن جو پڑھ کر سناتے ہیں وحی (آسمانی) ہے۔ جو ان پر نازل ہوتی ہے۔

اور بلاشبہ قرآن کا لانے والا وہی نبی ہے جس کی نسبت توراۃ میں سیکڑوں

برس پہلے خبر دی گئی تھی۔ کہ خدا اُس کے منہ میں اپنا کلام ڈالیگا۔

نزول قرآن کے وقت نبی کی کیفیت

قرآن جسوقت اترتا تھا یا بالفاظ دیگر جب خدا حضرت محمد صلعم کی زبان سے بولتا تھا۔ اسوقت آپ کے حالات بھی عام تکلم اور خطاب کے حالات سے بالکل ممتاز اور جداگانہ ہوتے تھے۔ کیونکہ بشری کالبد کو خدائی صفت کا مظہر بننا پڑتا تھا۔ اور تمام روحانی قوتیں اور ملکوتی طاقتیں جو موحی الیہ میں فطرةً ودیعت کیجاتی ہیں۔ اس مادی عالم سے یکسو ہو کر ملاء اعلیٰ اور عالم غیب کی طرف سمٹ جاتی تھیں۔ تو بشری خصائص اور ملکوتی قویٰ کے تجاذب اور تصادم سے قدرتی طور پر ایسے وقت میں وہ آثار بھی موحی الیہ کے جسم پر طاری ہونے پاتے ہیں۔ جو تمام حالات واوقات سے مباین ہوں۔ چنانچہ سیرت نبوی اور احادیث کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ خبر یا پوشیدہ نہیں ہیں۔ باقی تمام اوقات میں جو مکالمات و مخاطبات نبی اکرم صلعم کے ہوتے تھے ان میں ایسے آثار و علائم کا نام و نشان نہ تھا۔ کیونکہ اسوقت ایک بشر کا کلام تھا جو اسی کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ گو جن علوم و مطالب پر وہ کلام مشتمل ہوتا تھا۔ وہ کیسے ہی نادر اور عمیق بلکہ الہامی ہوں۔

قرآن کی عظمت کا اثر خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر

جسوقت نبی کریم صلعم قرآن کی تلاوت فرماتے تھے یا کسی دوسرے سے سنتے تھے تو آپ خود بھی

اسقدر متاثر ہوتے تھے۔ کہ خود اپنے کلام کو پڑھ کر اتنا متاثر ہونا عادۃً متصور نہیں، آپ کا چہرہ خوف سے متغیر ہو جاتا، آنکھیں بہنے لگتیں، گریہ طاری ہو جاتا، راتوں کو جب کہ مخلوق بستر استراحت پر آرام کرتی تھی، آپ خدا کے سامنے کھڑے ہو کر قرآن پڑھتے۔ حتےٰ کہ پاؤں سوج جاتے اور قدموں کا ورم دیکھ کر لوگ رحم کھاتے اور آپ فرماتے افلا اکون عبداً شکورا۔ ایک ہی آیت کو کبھی بار بار پڑھتے اور روتے تھے۔ غرض قرآن کا جو اثر آپ کی زبان سے سُننے والے صحابہ قبول کرتے تھے اُن سے زائد آپ پر ہوتا تھا۔

ایک صاحب بصیرت جو خوف خدا کی ذرا سی بھی ٹیس دل میں رکھتا ہو اتنی ہی بات سے قرآن کی نسبت ایمان لا سکتا ہے۔ کہ وہ محمد صلعم کی تصنیف نہیں ہے اور نہ وہ کسی ایسے بشر یا کمیٹی کی تصنیف ہے جن کا نام اور حال آں حضرت صلعم نے ساری عمر مخفی رکھا ہو۔

قرآن کا اثر سامعین پر کیا ہوا! قرآن نے اُس قوم پر کیا اثر ڈالا۔ جس نے اُسے نو بنو اور تازہ بتازہ پیغمبر صلعم کی زبان مبارک سے سنا تھا؟

اس سوال کا جواب تاریخ کے اُن درخشاں واقعات میں سے ہے جن کا اعتراف دوست اور دشمن ہر ایک کو کرنا پڑا ہے۔ دنیا نے جب سے جنم لیا، آسمان نے جب سے سایا ڈالا، زمین نے جب سے اپنی پُشت پر اولادِ آدم کو اٹھایا، کبھی ایسا

عظیم، ایسا سریع، ایسا محیر العقول انقلاب چشمِ فلک نے نہیں دیکھا ہوگا، جیسا بیمثال انقلاب عرب کی حالت میں بلاواسطہ اور سارے ربع مسکون کی روحانی حالت میں بالواسطہ اُس بیمثال خُدا کے اتارے ہوئے بیمثال قرآن کی بیمثال تعلیم سے نمودار ہوا۔

صاحب آیات بینات لکھتا ہے۔ کہ قرآنِ حکیم ایک ایسے زمانہ میں اُترا جب کہ دنیا ایک عجیب روحانی سکتے کی حالت میں تھی۔ اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا۔ اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمہ کی گئی جو سوای اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط رایوں اور وحشیانہ اعمال اور بداخلاقی اور نفاق اور جنگجوئی کے کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتے تھے۔ مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے ان پر ایسی عجیب وغریب تاثیر کی کہ اُس سے ان کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدل گئیں۔ برسوں کے بھٹکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے۔ اور مدتوں کے سوتے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے جو شرک تھے وہ موحد ہو گئے، جو کافر تھے وہ ایمان لائے، جو بُت پرست تھے وہ بُت شکن بن گئے، جو گمراہ تھے وہ خدا کی راہ دکھانے لگے، جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا ان میں نام نہ رہا، خاندانی جھگڑے پُرانی عداوتیں جاتی رہیں، اور دماغ نخوت وغرور سے خالی ہو گئے۔ اور ا...

صبر و تحمل، حلم و بردباری، زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے۔
آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست، پاک طبیعت، راست
باز، نیک دل لوگوں کا تیار کر دیا۔ جن کی کوششوں سے شرک و بت پرستی
کی آواز جو تمام جزیرہ نمائے عرب میں گونج رہی تھی۔ بند ہو گئی۔ اور اس
کے بدلے ایک، بے چون و بیچگون، بے شبہ و بے نمون خدا کی منادی پھر گئی۔
بتوں نے عدم کا راستہ لیا۔ بتخانوں کا نشان مٹ گیا۔ آتشکدے ٹھنڈے
پڑ گئے۔ تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ	حق ظاہر ہو گیا اور باطل مغلوب اور برباد ہو
إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا	باطل مغلوب ہی ہو کر رہتا ہے

کیا اس سے اس امر کا مشاہد اور درخشاں ثبوت نہیں ملتا کہ آپ
حقیقت میں سچے رسول اور خدا ہی کی طرف سے مؤید تھے۔ ورنہ انسان
کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت
میں پیدا کر دیتا اور ایسے جنگجو ستم پیشہ لوگوں کو جو بات بات پر لڑتے
اور جھگڑتے تھے، اخوت کے ایک رشتہ میں باندھ دیتا اور ان کی
پشتینی عداوتوں اور کینوں سے ان کے دلوں کو ایسا صاف کر دیتا کہ ان
کا کچھ اثر باقی نہ رہتا۔ بلکہ دنیا میں ان کو اخلاق اور انسانیت کا
نمونہ بنا دیتا۔

سرورِ کائنات صلعم کی ہدایت کی ایسی عجیب و غریب تاثیر اور ایسے حیرت انگیز نتائج کو دیکھ کر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں۔ کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرت سے خارج تھی۔ چنانچہ کوئی اُن میں سے کہتا ہے۔ کہ "وہ پیام جو آپ لائے وہ ایک سچا اور حقیقی پیام تھا جس کا مخرج وہی ہستی تھی۔ جس کی تھاہ کبھی کسی نے نہیں پائی" کوئی لکھتا ہے کہ "قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے۔ کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے۔ جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو" متعصب سے متعصب عیسائیوں کا یہ اقرار ہے۔ کہ دین مسیحی کی ابتدا سے آں حضرت صلعم کے وقت تک کبھی حیات روحانی ایسی برانگیختہ نہیں ہوئی تھی۔ جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی

خدا نے جس سے کلام کیا یعنی قرآن اُس پر اُتارا اُسکی فہم و اخلاق کا کیا حال تھا؟

اب قرآن کے کلام الٰہی ہو سکنے پر ایک اور طرف سے بھی غور کرو۔ دیکھو کہ خداوند اکبر نے جس کی زبان سے کلام کیا اُس کی فطرت کیسی تھی؟ پیدائشی طور پر اُس نے دل و دماغ کیسا پایا تھا؟ فہم کیسا تھا اخلاق کیسے تھے؟ کس قسم کے ہوش و حواس، تدبیر و تیقظ، انسانی ملکات باطنی خصائل ظاہری

شمائل پر وہ مفطور و مخلوق ہوا تھا؟

دنیا کے چھوٹے چھوٹے راجہ اور سلاطین بھی باوجودیکہ وہ ہم ہی جیسے انسان ہیں تھوڑی سی فانی عزت اور ناپائدار خودداری کے طفیل میں ہر کس و ناکس کو منہ نہیں لگاتے۔ نہ ہر ایک کو اپنی مسند قرب و ہم نشینی پر جگہ دیتے ہیں۔ نہ ہر ایک کو ہمکلامی کا شرف بخشتے ہیں۔ نہ ہر ایک کی زبان سے بولنے اور تقریر کرتے ہیں مخصوص اشخاص ہوتے ہیں جن کو مجالست اور مکالمت اور ترجمانی کا حق دیا جاتا ہے۔ یا بطور معتمد خاص یا قائم مقام خاص کے نامزد کرتے ہیں۔ ہرگز یزد السرائے نہیں بنایا جاتا ہر ترک پاشا نہیں ہوتا، ہر سوئیلین کا یہ درجہ نہیں، کہ وائسرائے سے بلاواسطہ گفتگو کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ ہر ایک انسان خدا کا مکلم یا رسول یا نبی یا اُس احکم الحاکمین کا نائب السلطنۃ بنائے جانے کے قابل نہیں۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ — خدا جس جگہ اپنی پیغمبری رکھا کرتا ہے وہ اس جگہ کے حفظ اور قابل اطمینان ہونے کو بھی خوب جانتا ہے

اس بات کا تفصیلاً ذکر کرنا کہ کس قسم کے نفوس حق تعالٰے شانہ کی ہمکلامی سے مشرف ہو سکتے ہیں۔ میرے لئے مشکل ہے اور وقت بھی اجازت نہیں دیتا کہ میں ایسی لمبی بحث کو چھیڑ دوں اور اپنی بضاعت اور کفایت

کے قدر اس کے متعلق کتاب العقل والنقل میں عرض بھی کر چکا ہوں لیکن اجمالاً اسقدر گزارش کر دینا مناسب ہے کہ جو شخص منصب نبوت پر فائز کیا جائے ضروری ہے کہ فطری طور پر اُس کی دماغی قوتیں اور قلبی ملکات اور عام اخلاقی حالات تمام اقران سے اعلےٰ وارفع ہوں۔ فہم دانش، عزم واستقلال، صبر وثبات، خلوص نیت و ہمدردی خلائق، محنت، جفاکشی اور خدا کی اطاعت ووفاداری کے جذبہ سے اُس کا ظاہر و باطن رنگا ہوا ہو۔ کوئی شخص یہ خیال نہیں کر سکتا کہ ان ملکات اور قویٰ کے فقدان کی صورت میں خدائے قادر و توانا جس کا علم ازلی تمام ماکان و مایکون کو محیط ہے۔ اپنی بھاری ذمہ داری اور نیابت الٰہیہ اور امانت عظیمہ کو کیف ما اتفق کسی معمولی انسان کے سپرد کر دیگا۔ قرآن کے لانیوالے کی سیرت (لائف) کو جب ہم اس معیار پر رکھتے ہیں تو ہم کو ناگزیر اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ آج تک جتنے آدمیوں کی نسبت ملہم اور مکلّم ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ ان سب میں زیادہ اقدم واحق اور اس منصب جلیل کا باعتبار اپنے فوق العادۃ قوائے عقلیہ وعملیہ کے دنیا کا وہ سب سے بڑا انسان ہی ہو سکتا ہے جس کو ہم نبی امی اور پیغمبر عربی کے مشہور اور معروف لقب سے یاد کرتے ہیں۔ فداہ ابی وامی۔ اللھم صل علی سیدنا ومولانا محمد وآلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم ط

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ اور حالات زندگی اور حضور کی بعثت کا ایک ایک لمحہ ان ضخیم اور مستند کتابوں میں محفوظ ہے۔ جن سے بڑھ کر روایت کے ہاتھ میں کوئی قابل اعتبار اور باوثوق ذخیرہ نہیں ہے۔ آپ کے پیرؤوں نے آپ کی سوانح زندگی اور تمامی اقوال وافعال اور حرکات وسکنات کو اسقدر اہتمام واستیعاب و دیانت، تیقظ اور شغف سے محفوظ رکھا کہ وہ ایک مستقل فن بن گیا۔ بلکہ اس فن سے پھر کئی فن نکل آئے۔ غالباً کسی امت نے اپنی آسمانی کتاب کی بھی حفاظت اتنی نہ کی ہوگی جسقدر امت محمدیہ نے اپنے پیغمبر کے حالات کی کی اور بیشک ایسے نبی کے حالات کی جو ابدی مذہب اور نہ منسوخ ہونیوالا کلام لیکر آیا ایسی ہی حفاظت ہونا چاہیئے تھی۔ تامرور دہور کے بعد بھی کوئی شخص اس ہدایت کے قبول کرنے سے منہ نہ پھیر سکے جسے لیکر آپ تشریف لائے تھے۔ اور یہ حیلہ نہ بنا سکے کہ ہم کو ملہم کے حالات ہی جب معلوم نہیں تو ہم کس طرح پورا پورا اطمینان کر سکتے ہیں۔ کہ خدا کا کلام لانیوالا ویسی ہی عظمت وشان کا انسان تھا۔ جو اس عہدۂ جلیلہ کیلئے ضروری ہے حدیث اور سیر کی بیشمار کتابوں کی تلخیص میں اس جگہ نہیں کر سکتا۔ البتہ آں حضرت صلعم کی اعلیٰ فہم اور اعلیٰ اخلاق کے متعلق ایک دو چیزیں اپنے رسالہ ھالا۔ لام ہلا سے نقل کرتا ہوں جو اس موقع پر انشاء اللہ کفایت کریگی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت اخلاقی و عقلی

عرب کی جہالت، درشت مزاجی، گردن کشی کو کون نہیں جانتا۔ جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ کوئی کتاب اُن کے پاس آسمانی ہو نہ زمینی اور اُن کے اخلاق کا یہ حال کہ قتل و غارت وغیرہ ایک معمولی حرکت ہو، عقل و فہم کی یہ کیفیت ہے کہ پتھروں کو اٹھا لائے اور پوجنے لگے۔ اور گردن کشی کی یہ صورت کہ کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں۔ جفاکشی کی یہ نوبت کہ ایسے ملک میں شاد و خرم زندگی گذار دیں۔ ایسے جاہلوں اور خود سروں کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا، چہ جائیکہ علمِ الٰہیات، علم معاملات، علم عبادات، علمِ اخلاق، علمِ سیاست مدن میں حکماء نامدار بنا دیا۔ یہاں تک کہ دنیا نے ان کی اور اُن کے شاگردوں کی شاگردی کی۔

ڈاکٹر گسٹاؤ لیبان کہتا ہے:۔

"اس پیغمبر اسلام، اس نبی امی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے جس کی آواز نے" ایک قوم ناہنجار کو جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہیں آئی تھی رام کیا۔ اور اُس درجہ پر پہنچایا کہ اُس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا اور اس وقت بھی "وہی نبی امی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمۂ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے"

اگر انصاف کرو تو آپ کے حسن اخلاق کا اندازہ کرنے کے لئے یہی کافی ہے۔ کہ آپ نہ کہیں کے بادشاہ تھے۔ نہ بادشاہ کے گھرانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ نہ کچھ مال و دولت آپ نے جمع کر رکھا تھا۔ نہ باپ دادا نے کوئی اندوختہ میراث میں چھوڑا تھا۔ نہ آپ کے پاس تنخواہ دار فوج تھی، نہ اہل وطن آپکے ہمراہ تھے، نہ قبیلہ والوں کو آپ کے مذہب سے ہمدردی تھی۔ ایسی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں آپ نے ان تند خو گنواروں کو ایک ایسی صدائے ناموس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھ کر اسوقت ساری دنیا میں کوئی مکروہ آواز نہ سمجھی جاتی تھی۔ اور نہ ایسی صدا دینے والے سے زیادہ اُن کے نزدیک کوئی ان کا دشمن اور بدخواہ سمجھا جاسکتا تھا۔ یہ وہی لاالٰہ الا اللہ کی آواز تھی کہ جس نے دفعتہً تمام عرب میں تہلکہ ڈالدیا، جس سے باطل معبودوں کی حکومت میں بھونچال آنا شروع ہو گیا۔ اور جس کی چمک سے اس کفر و جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کوند گئی۔ گویا وہ ایک زور و شور کی ہوا تھی۔ جس کے چلتے ہی شرک و بُت پرستی کے بادل چھٹ گئے۔ اور آفتاب توحید ابر کے پردے سے باہر نکل آیا، یا ابابیل رحمت تھی جس کی بوچھاڑ نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھیوں کے پرخچے اڑا دئیے۔ اور خدا کے گھر کو ان کی زد سے بچالیا۔ غرض کہ ایک ایسے بے یار و مددگار نے ایسی سخت قوم کو ایسی ظلمت کے زمانہ میں ایسے اجنبی مضمون کی طرف اُبھارا۔ اور تھوڑے عرصہ میں ان سب

کو ایسا مسخر اور گرویدہ بنالیا۔ کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کیلئے تیار ہو گئے۔ گھربار کو ترک کر دیا، زن و فرزند سے بگاڑ لی، مال و دولت کو سنگریزہ دل سے حقیر سمجھا۔ اپنے بیگانوں سے آمادہ جنگ و پیکار ہوئے، کسی کو آپ نے مارا، کسی کے ہاتھ سے آپ مارے گئے، پھر دو چار روز کا دلولہ نہ تھا، بلکہ آپ کے بعد اسی حالت پر استقلال کیساتھ جمے رہے۔ یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیئے، فارس و روم کو تہ و بالا کر دیا۔ اور اس پر معاملات میں وہ شائستگی رہی کہ کسی لشکری نے سوائے مقابلۂ جہاد کسی کی ایذا رسانی یا ہتک ناموس کو گوارا نہ کیا۔ یہ تسخیر اخلاق تبلائیے اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی سے ظاہر ہوئی ہے؟

یہ تو آپ کے اخلاق کی حالت تھی۔ باقی آپ کی عقل و فہم کا نشان سب سے بڑا یہی ہے۔ کہ آپ بذاتِ خود امی محض جس ملک میں پیدا ہوئے، جہاں ہوش سنبھالا، بلکہ ساری عمر گذاری، علوم سے یکلخت خالی، نہ وہاں علوم دینی کا پتہ نہ دنیاوی کا نشان، پھر اس پہ ایسا دین ایسا آئین، ایسی کتاب لاجواب اور ایسی ہدایات بینات لائے کہ آج تک بڑے بڑے حکماء اس کا جواب نہیں لا سکے۔ بلکہ بڑے بڑے مدعیان عقل و تہذیب نے اس کی داد دی۔ قرآن جیسا زندہ اور علمی معجزہ کس پیغمبر کو

دیا گیا۔ جس کا مقابلہ کیا باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور کیا باعتبار علوم و مضامین کے اور کیا باعتبار تحریف و تبدیل سے محفوظ رہنے کے دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی اور نہ انشاءاللہ تعالےٰ کر سکے گی۔

قرآن کے حق میں ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کہ خود قرآن تیرہ سو برس سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ جس میں ہمت ہو وہ میرا جواب لکھدے۔ مگر آج تک کسی کا حوصلہ نہ ہوا اور نہ ہو گا کہ اس کی ایک چھوٹی سی سورۃ کی مثال بھی پیش کر سکے۔

اب میں اس کے سوا کیا کہوں کہ اُس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اپنی عادات و اخلاق میں تمام انبیاء علیہم السلام سے فائق تھے۔ ایسے ہی علوم کے بھی سارے مراتب آپ پر تمام کر دیئے گئے تھے۔ کیونکہ انبیاء سابقین میں نہ ایسا اعجاز علمی کسی کو دیا گیا، نہ اُن کے اتباع میں کسی نے ان علوم کے دریا بہائے ہیں۔ جو اہل اسلام نے بہائے ہیں۔ اور جب کہ صفت علم تمام ان صفات کی خاتم ہے۔ جو مربی عالم میں ہیں تو جس کا اعجاز علمی ہو گا۔ گویا اس پر تمام کمالات علمی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اور اسی کو ہمارے نزدیک خاتم الانبیاء کہنا مناسب ہو گا اور چونکہ اُس کا دین قیامت تک رہیگا۔ اس لئے اُس کی کتاب کا بھی تا قیامت باقی رہنا ضروری ٹھہریگا۔

قرآن کریم کی حفاظت پس جس طرح قرآن کی ہر ایک ادا انوکھی اور ہر ایک شان نرالی ہے، ضروری ہوا کہ اُس کی حفاظت بھی بالکل نرالے طریقہ اور نئے رنگ ڈھنگ سے ہو اور چونکہ وہ محض خدا کی کتاب ہی نہیں بلکہ اس کا کلام معجز ہے۔ اس لئے نہ صرف اس کے مطالب اور علوم بلکہ اس کی عبارت اور الفاظ بھی تغیر و تبدیل سے مصئون و مامون رہے۔ بظاہر یہ ایک ایسا مشکل اور اہم اور پُر صعوبت مقصد تھا۔ کہ اگر اس کا انصرام صرف ناتوان بندوں کی مرضی، ہمت، تدبیر اور انتظام کے حوالہ کر دیا جاتا اور ایک خاص قسم کی توفیق ربانی اُن کی مدد نہ کرتی تو کسی طرح اُس کا سرانجام آسان نہ تھا، لیکن اس سے پہلے کہ بندے اس کی حفاظت کے سامان مکمل کرتے خود قرآن اُتارنے والے نے بڑے مؤکد اور قطعی عنوان سے اس کا تکفل فرمالیا۔ چنانچہ اُسی وقت جب کہ کسی انسان کو یہ یقین کر لینے کے لئے بظاہر کچھ اسباب موجود نہ تھے۔ کہ قرآن بھی معاذاللہ کچھ زمانہ کے بعد ویسے ہی غلط اور محرف ترجموں کی صورت میں باقی نہ رہجائیگا جس میں کہ توراۃ و انجیل موجود ہیں صاف صاف اعلان فرمادیا گیا کہ:۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝	بیشک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور بیشک ہم ہی اس کے نگہبان بھی ہیں۔

یہ وعدہ الٰہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز ذرائع سے پورا ہوکر رہا جیسے

دیکھ کر بڑے بڑے متعصب اور مغرور مخالفوں کے سر بھی نیچے ہو گئے
جس طرح قرآن کی بے نظیر فصاحت و بلاغت کے آفتاب نے لمبے چوڑے
دعوے کرنے والوں کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ اسی طرح اُس کی بے عدیل حفاظت
و خدمت نے بھی ایک مرتبہ اور تاریخ کو اپنی مثال پیش کرنے سے عاجز کر دیا۔
ہر زمانہ میں ایک جم غفیر علماء کا جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ایسا رہا
کہ جس نے قرآن کے علوم و مطالب اور غیر منقضی عجائب کی حفاظت کی۔
کاتبوں نے رسم الخط کی، قاریوں نے طرزِ ادا کی، حافظوں نے اُس کے الفاظ
اور عبارت کی وہ حفاظت کی کہ نزول قرآن کے وقت سے آج تک ایک زبر
یا زیر تبدیل نہ ہو سکا۔ کسی نے قرآن کے رکوع گن لئے، کسی نے آیتیں
شمار کیں، کسی نے حروف کی تعداد بتلائی۔ حتیٰ کہ بعض نے ایک ایک اعراب
اور ایک ایک نقطہ کو شمار کر ڈالا۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد
مبارک سے آج تک کوئی لمحہ اور کوئی ساعت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی
جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد حفاظ قرآن کی موجود نہ ہو۔ جنہوں
نے کاغذ کے اوراق میں نہیں جو مٹ جانے اور جل جانے کا امکان رکھتے
ہیں۔ سیاہی کے نقوش میں نہیں جن کے محو یا مشکوک ہو سکنے کا احتمال
ہے۔ لکڑی اور لوہے کے صندوقوں میں نہیں جن کے کھوئے جانے
یا ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ بلکہ اپنے دلوں کے اوراق میں اور سینوں کے

صندوقوں میں بڑی احتیاط اور خبرداری سے محفوظ رکھا۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۔ مگر جن لوگوں کو عقل دی گئی ہے ان کے عقیدہ میں تو یہ (قرآن ایسی لکھی ہوئی آیتیں ہیں کہ کوئی منصف مزاج انکار نہیں کرسکتا)

خیال کرو کہ ۸۔۱۰ سال کا ہندوستانی بچہ جیسے اپنی مادری زبان میں دو تین جزو کا رسالہ یاد کرانا دشوار ہے وہ ایک غیر ملکی زبان کی اتنی ضخیم کتاب کو جو متشابہات سے پُر ہے کسطرح فرفر سنا دیتا ہے۔ رمضان المبارک میں اسلامی مساجد کا وہ سین دیکھنے کے قابل ہے جب چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ننھی آواز اور معصومانہ لہجہ میں قرآن شریف سنا کر سامعین کے دلوں کو وجد میں لے آتے ہیں۔ پھر کسی مجلس میں ایک حافظ سے کوئی حرف چھوٹ جائے یا اعراب کی فروگذاشت ہو جائے تو چاروں طرف سے تصحیح کرنے والے للکارتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ پڑھنے والوں کو غلطی پر قائم رہنے دیں۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر تاریخ سے دریافت کرو کہ کیا قرآن کے سوا کبھی دنیا میں کسی اور کتاب کی بھی اسقدر حفاظت اور خدمت ہوئی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ کتنا ہی بڑا نکتہ چینی کرنے والا کیوں نہ ہو اسقدر انصاف کشی نہ کرسکے گا۔ کہ وہ قرآن کی اس بےمثال حفاظت میں بھی شبہ اور تردّد کرنے لگے۔

باقی ایسے سوفسطائیوں سے میرا خطاب نہیں جو محسوسات اور مشاہدات میں بھی لاادری کہنے سے دریغ نہ کریں۔

قرآنِ کریم کی تعلیم

قرآن کریم نے تمامی ابواب ہدایت کے متعلق جو کچھ تعلیم دی ہے اس کی پوری تفصیل کسی انسانی بیان میں کہاں سما سکتی ہے۔ قرآنی علوم کا دریائے ناپیدا کنار کس کی مٹھی میں آسکتا ہے۔ اور کس بشر کی طاقت ہے کہ وہ اُس رب العزت کے سمندر کو ایک کوزہ میں بند کر سکے۔ لیکن قرآن کے اعجازوں میں سے شاید یہ بھی ایک اعجاز ہے۔ کہ وہ جسقدر مشکل ہے اسی قدر آسان بھی ہے، جتنا طویل و عریض ہے، اتنا ہی مختصر بھی ہے۔ یعنی جس طرح وہ ایک بڑے سے بڑے روشن دماغ حکیم کا پیٹ حکمتوں سے بھر دیتا ہے۔ اُسی طرح ایک وحشی سے وحشی انسان کی پیاس بھی اپنے چشمۂ ہدایت سے بجھا سکتا ہے۔

میں اسوقت قرآن کے علوم و معارف کا تھوڑا سا اندازہ کرنے کیلئے بڑے بڑے کتب خانوں اور درسگاہوں کا حوالہ نہیں دیتا بلکہ ایک بہت ہی سہل طریقہ بتلاتا ہوں۔ کہ مضامین روحانیت اور ابواب ہدایت میں سے جو مضمون اور باب چاہو لے لو اور جتنی کتابیں آسمانی ہونے کی مدعی ہیں اُن میں صرف اُس ایک باب کے متعلق جو تعلیمات ہیں ہر ایک مذہب والا انتخاب کر کے پیش کر دے۔ انسانی کتابوں

اور آراء سے کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔ جو کچھ ہو آسمانی کتاب کے حوالہ سے مع اصل عبارت کے ہو۔ اور عبارت کا صحیح ترجمہ ملکی زبان میں کر دیا جائے۔ اُس کے بعد وہ سب تحریریں کسی ایک متفق علیہ حکم کے سامنے یا اگر یہ نہ ہو سکے تو عام پبلک کے روبرو پیش کر دی جائیں۔ بیک نگاہ سب کے سامنے آنے سے دنیا خود فیصلہ کر لے گی۔ کہ کس کتاب کی تعلیم اس باب میں زیادہ جامع، زیادہ موثر، زیادہ مبرہن، زیادہ قابل قبول ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر آسان اور بے تکلف صورت تعلیمی موازنہ کی اور کوئی نہ ہو گی۔ ع

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

قرآن کریم میں اللہ جل شانہٗ کے کمالات و صفات کا بیان اور ذکر اللہ کی کثرت	مولانا فیروزالدین صاحب ڈسکوٹی اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں۔ "پھر ایک

بڑی بھاری دلیل قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونے کی یہ ہے۔ کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کو نہایت اعلیٰ طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کلامِ الٰہی کا خاصہ ہے۔ کہ اس میں خالق کائنات کی تمام صفات کاملہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان اور اس کی صفات کمالیہ ایسے طور پر مذکور ہوتی ہیں۔ کہ دنیا کی کوئی کتاب اس

کامقابلہ نہیں کر سکتی - قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ ایسے ڈھنگ سے بیان ہوئی ہیں - کہ اس خصوصیت میں دنیا کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتی، بات بات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت شان چمکتی ہے - اور اس کی الوہیت، ربوبیت، خالقیت، رحمانیت اور قدوسیت اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر جلوہ گر ہوتی ہے - سارا کلام الٰہی اسماءِ حسنیٰ اور صفات کاملہ رب العالمین سے بھرا پڑا ہے - چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ کا ذکر اور اس کا نام اس کثرت سے آتا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اُس کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی - گویا قرآن شریف جابجا خدا کا نام یاد کرنے کیلئے اک بہانہ اور موقع ڈھونڈتا ہے - قرآن شریف کا کوئی صفحہ الٹاؤ، اس کا کوئی حصہ پڑھو - اس میں اللہ کا نام یا اُس کی کسی اور صفت کا ذکر ضرور پاؤ گے - قرآن شریف میں صرف دعائیں اور خدا کی صفات ہی نہیں بلکہ اس میں تمام معاملات دینی و دنیوی اور قوانین قومی اور ملکی بھی بیان کئے گئے ہیں - بایں ہمہ اس میں اللہ تعالیٰ کا نام اور اس کے اسماءِ حسنیٰ جابجا پائے جاتے ہیں - ایسی جگہوں پر اور ایسے معاملات میں بھی جہاں انسان سے سخت دشوار ہے کہ اللہ کا نام لا سکے قرآن میں اللہ کا لفظ ۲۶۶۶ دفعہ آیا ہے اور اس کے باقی اسماءِ حسنیٰ کا کچھ شمار نہیں اور جو ضمائر اللہ تعالیٰ کی طرف

پھرتی ہیں۔ ان کی گنتی بجز خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔

تسبیحات اور تہلیلات اور دعاؤں وغیرہ کے موقعہ پر تو اللہ تعالیٰ کا نام آہی جاتا ہے۔ لیکن معاملات اور تعزیرات کے موقعہ پر بھی جس طرح قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا نام آیا ہے وہ صرف قرآن شریف ہی سے خصوصیت رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب اس خصوصیت میں قرآن شریف سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ توریت وانجیل وغیرہ کے صفحوں کے صفحے خدا کے ذکر اور اس کے نام سے خالی ہیں۔ لیکن قرآن شریف کا کوئی صفحہ کوئی حصہ الٰہی یاد اور الٰہی نام سے خالی نہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس انتظام اور اس معاملہ کا طرز بیان اور اسلوب ہی ایسے ڈھنگ پر ڈالا ہے۔ کہ خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ کا نام اور اس کا ذکر کہیں بیچ میں ضرور آجائے۔ کوئی معاملہ، کوئی واقعہ، کوئی قصہ ایسا نہیں جس میں بار بار اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ آئے۔ قرآن شریف کے پڑھنے سے نہ صرف دینی احکام اور الٰہی شریعت سے آگاہی ہوتی ہے۔ بلکہ کلام ربانی سارے کا سارا یاد الٰہی سے پُر ہے۔ صفحے الٹتے جاؤ اور خدا تعالیٰ کا نام بار بار پڑھتے جاؤ۔ اور خدا تعالیٰ کا نام بار بار پلٹتے جاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت میں بھی کمال ثواب ہے کیونکہ وہ اسماء حسنیٰ سے پُر اور درود اور وظیفے کی بھی ایک مقدس کتاب ہے۔ مثال کے طور پر ایک سورۂ طلاق کو لے لو۔ سورۂ طلاق کے نام ہی سے

تو مفہوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں صرف عورتوں کے طلاق دینے کی بابت احکام و ہدایات ہونگی۔ لیکن نہیں اس میں عبرت، وعظ، تذکیر اور خدا تعالٰے کے مقدس ناموں کا وظیفہ بھی ہے۔ چنانچہ اس چھوٹی سی سورت میں پچیس ۲۵ جگہ "اللہ" کا لفظ اور دو جگہ "رب" کا لفظ آیا ہے۔ اور بہت سی ضمائر خدا کی طرف پھرتی ہیں۔ باوجودیکہ اس سورت میں معاملہ طلاق کا ذکر ہے۔ جس کو اگر کوئی اور شخص بیان کرتا تو شاید ایک دو جگہ بھی اللہ کا نام نہ لاتا۔"

اچھا ہر ایسی کتاب کا جو آسمانی کہی جاتی ہو کیف ما اتفق ایک ایک صفحہ ہاتھ میں اٹھالو اور شمار کرلو۔ کہ اس صفحہ میں خدا کا نام کتنی جگہ اور کیسی عظمت و شان سے آیا ہے۔ یہ موٹی سی بات ہے۔ پتہ دیدیگی۔ کہ کونسی کتاب آسمانی ہے۔ جو کسی معاملہ میں ذراسی دیر کے لئے اپنے پڑھنے والے کو خدا کی یاد سے غافل نہیں رہنے دیتی۔ اور جو اس کا امکان بھی نہیں چھوڑتی۔ کہ ہزارہا سال تک کروڑوں انسان اگنی وغیرہ الفاظ سے جو بقول سوامی دیانند پرمیشور کے نام تھے۔ آگ اور دوسرے عناصر وغیرہ سمجھ کر خدا کی جگہ ان ہی چیزوں کی عبادت (پوجا) کریں۔

قرآن کریم کی بینظیر سلاست اور روانی | مولانا فیروز الدین فرماتے ہیں "پھر ایک دلیل قرآن شریف کے کلام ربانی ہونے کی اس کی وہ لاثانی بندش اور

بےنظیر روانی ہے جسپر آج تک ایک دنیا شیدا ہے - کوئی عربی عبارت پڑھو اُس کی بندش اور روانی معمولی قسم کی ہو گی - لیکن قرآن شریف کی روانی اور سلاست اس قسم کی ہے - کہ جو لوگ معنے نہیں جانتے، جو لوگ عربی سے کچھ مس نہیں رکھتے وہ بھی اس کی روانی اور سلاست کو دیکھ کر شیفتہ اور حیران ہیں - خوش آواز قاری جب قرآن شریف کو ایک لحن مرغوب اور اسلوب خوش سے پڑھتا ہے - تو دلوں میں زلزلہ اور روحوں میں ولولہ ڈالدیتا ہے عام قاری و حافظ جب قرآن شریف کو ایک جوش کے ساتھ پڑھتے ہیں - تو کسقدر اثر قلب پر ہوتا ہے - دنیا کے سردار حضرت رسول کریم صلعم جب اس کلام پاک کو پڑھتے ہونگے - تو سننے والوں کے دلوں پر کیا کچھ اثر پہنچتا ہو گا - کلام الٰہی کے الفاظ واقعات کی زندہ تصویریں معلوم ہوتی ہونگی - جو سُننے والے کے پیش نظر ہیں - کس شخص کی طاقت ہے - کہ قرآن شریف کی سلاست اور روانی کی بابت کچھ بیان کر سکے - وہ ایک وجدانی امر ہے - اور وجدانیات کی لذت کو بجز چکھنے کے کس کو یارا ہے - کہ معرض تحریر یا تقریر میں لا سکے - قرآن شریف کی عبارت پر جیسے پڑھے ہوئے مفتون ہیں - ویسے ہی ان پڑھ عاشق ہیں - یہی عبارت کی روانی اور دلوں پر عجیب اثر ڈالنے والی جادو بیانی کفار عرب کو اس بات کے کہنے پر مجبور کرتی تھی کہ :-

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ٥

یہ (قرآن) تو بس (ایک قسم کا) جادو ہے جو اگلوں سے چلا آتا ہے اور بس تو کیا تم دیدہ و دانستہ جادو کی باتیں سننے) کو آتے ہو

تمام آسمانی کتابوں کے مدعی اس طرح موازنہ کر لیں۔ کہ ہر کتاب کی تھوڑی سی عبارت جس طرح پڑھی جاتی ہے۔ کسی اچھے صحیح اور صاف پڑھنے والے سے مجلس میں پڑھوا کر دیکھیں خود معلوم ہو جائیگا۔ کہ قلوب کس سے زیادہ لذت اور اثر حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کریم عام اشعار کی طرح کلام منظوم نہیں لیکن اس نے نظم کی روح نکال کر نثر میں ڈالدی ہے۔ ایک بالکل ہی اچھوتا اسلوب عام نثر اور نظم کے درمیان اختیار کیا ہے۔ کہ شاعر اور خطیب دونوں کی روحیں سو جان سے اس کی لطافت اور شوکت پر قربان ہوتی ہیں۔ قرآن کی ان حسی اور معنوی خوبیوں کو دیکھ کر بیساختہ زبان پر آجاتا ہے۔ کہ

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد   برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

قرآن میں ایک مضمون دوسرے سے مغلوب نہیں ہوتا:

انسان چونکہ مخلوق ہے۔ اور کمزور مخلوق ہے اس لئے جب اس پر کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو اس کے خصائل والی حالت مضمحل اور مغلوب ہو جاتی ہے۔ بڑے سے بڑا قادر الکلام لیکچرار جب غصہ میں بھرا ہوا مضمون بیان کرتا ہے۔ تو عین

اسی وقت ملاطفت اور مہربانی کی تقریر ویسے زور سے نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شفقت و رحمت کیساتھ اگر غضب و سخط کی بھی ضرورت ہو تو دونوں کا مساویانہ توازن قائم رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ صرف خداوند اکبر ہی کی ذات کا خاصہ ہے۔ جس کی ایک صفت دوسری صفت کیلئے مزاحم نہیں ہوتی۔ اور جس کو ایک شان دوسری شان سے مشغول نہیں کر سکتی کہ وہ ہر وقت و ہر آن تمامی متقابل صفات کیساتھ متصف ہے۔ اسی لئے جب اُس کے کلام کو ہم پڑھتے ہیں تو رحمت کے ساتھ غضب، وعدہ کیساتھ وعید، تبشیر کے ساتھ انذار اور خوف کے ساتھ رجا ترازو کے دو پلّوں کی طرح ہمیں برابر نظر آتے ہیں۔ جن میں سے کوئی بھی دوسرے سے جھکا نہ ہو۔ عین غصہ کے وقت پیار اور پیار کیساتھ غصہ اس طرح کہ ایک کا بیان دوسرے سے وزن میں گھٹنے نہ پائے یہ صرف اُسی رب العالمین کے کلام میں دیکھا گیا ہے۔

قرآن میں غیبی خبریں | قرآن کے مضامین کے متعلق ایک اور ضروری چیز بیان کرنے سے رہ گئی اور وہ امم ماضیہ اور سنین گذشتہ کی ایسی مفصل اور درست خبریں اور واقعات مستقبلہ کے متعلق اس کی متعدد پیش گوئیاں ہیں۔ جو حرف بحرف صحیح ثابت ہو چکیں۔ یہ نہیں کہ کاہنوں اور منجموں کے اٹکل پچو بیانات کی طرح سو میں ایک دو دفعہ تیر نشانہ پہ جا لگا۔ بلکہ قرآن نے جن واقعات کی خبر دی وہ صبح صادق کی روشنی کی طرح نور افزا

دیدۂ بصیرت ہوئے۔ مثال کے طور پر آپ اس آیت کو لے لیجئے۔

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۔ قریب کے ملک (یعنی فارس) میں رومی (جو نصاری ہیں اہل کتاب) فارس سے جو آتش پرست ہیں مغلوب ہو گئے ہیں لیکن وہ لوگ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب چند سال میں پھر اہل فارس پر غالب آجائیں گے

عجم پر روم کے غلبہ کے متعلق جو خبر جتنے زمانہ کی ساتھ مقید کر کے اس آیت میں دی گئی تھی۔ وہ بلا کم و کاست پوری ہوئی۔ اگر آپ قرآن کی پیشین گوئیوں کے متعلق مفصل دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو علماء نے اس باب میں مستقل رسالے لکھے ہیں اُن کو مطالعہ کیجئے۔ میں نے تو صرف ایک نمونہ دکھلا دیا ہے۔ اخبار ماضیہ میں بعض کور چشم یہ کہہ دیتے ہیں کہ شاید آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے پوچھ کر درج کر دیئے ہوں گے۔ حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں۔ کہ آپ خود امی تھے، آپ کی قوم امی تھی، مادری زبان عربی کے سوا کوئی دوسری زبان آپ نے سیکھی نہیں تھی، کسی عالم کی ملازمت و صحبت کا آپ کو موقع نہیں ملا۔ جو اسقدر مفصل اور مستند واقعات اخذ کر سکتے اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ جن کے پیش نظر آپ کی زندگی کے تمام اطوار و ادوار تھے۔ اور پھر ہر وقت ایسی چیزوں کا کھوج لگانے میں سرگرم تھے۔ جو آپ کی تکذیب کا ذریعہ بنیں۔ تئیس ۲۳ سال کی طویل مدت میں سب سے پہلے ایسی شہادتیں بہم پہنچا کر شائع کر دیتے۔ شاید اسی لئے قرآن کریم

نے ایسے غیر ناشی عن الدلیل احتمالات کا ذکر نا بھی ضروری نہ سمجھا۔ صرف اسقدر تنبیہ کر دی کہ نبی امی صلعم پچھلے واقعات بن دیکھے بیان کر رہے ہیں۔ وہ اس کے سوا نہیں کہ وحی الٰہی نے اُن کو معلوم کرائے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:-

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا

(اے پیغمبر) یہ غیب کی چند خبریں ہیں جنکو وحی کے ذریعہ ہم تم کو پہنچاتے ہیں۔ (اس قرآن کے نازل ہونے) سے پہلے نہ تو تم ہی ان کو جانتے تھے۔ اور نہ تمہاری قوم کے لوگ۔

اور فرماتے ہیں:- ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝

(اے پیغمبر) یہ چند غیب کی باتیں ہیں جنکو ہم وحی کے ذریعہ سے تمہیں معلوم کراتے ہیں (اور یہ تمہاری صداقت کی دلیل ہے) جس وقت یوسف کے بھائیوں نے اپنا مصمم ارادہ کر لیا تھا (کہ یوسف کو کنوئیں میں ڈال دیں) اور وہ (ان کے ہلاک کی) تدبیریں کر رہے تھے۔ تم تو اُنکے پاس موجود نہ تھے۔ (کہ یہ حالات تمکو بطور خود معلوم ہو جاتے)

اور فرماتے ہیں۔ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ

اور (اے پیغمبر) جس وقت ہمنے موسیٰ کو (رسالت کے) اختیارات دیئے تو تم (طور کے) مغربی جانب (جہاں موسیٰ کو رسالت ملی تھی موجود) نہ تھے اور تم (اس واقعہ کے) چشم دید گواہ نہیں تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہمنے بہت سی اُمتیں نکال کھڑی کیں اور ان پر بہت سے قرن گذر گئے اور تم مدین کے لوگوں میں رہ کر تم اُنکو ہماری آیتیں پڑھکے سناتے تھے (اور یوں تمکو اس قصہ کے حالات معلوم کرنیکا موقعہ ملا ہو) بلکہ ہم کو (تمہیں پیغمبر

اٰیٰتِنَا وَلٰکِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ ۝
وَمَا کُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ
اِذْ نَادَیْنَا وَلٰکِنْ رَّحْمَۃً
مِّنْ رَّبِّکَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّآ اَتٰھُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ
قَبْلِکَ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ۝

بنا کر بھیجنا منظور تھا۔ اور اُس وقت کہ ہم نے موسیٰ کو بلایا تھا
تم طور کے (کسی) طرف موجود تھے کہ تم نے وہ واقعہ بچشم خود دیکھا ہو
بلکہ (یہ) تمہارے پروردگار کی (ایک) مہربانی ہے
تاکہ تم ان لوگوں کو ڈراؤ جن کے پاس تم سے پہلے
کوئی ڈرانیوالا نہیں آیا۔ عجب نہیں (تمہارے
ڈرانے سے) یہ لوگ نصیحت پکڑیں۔

واقعات گذشتہ میں آپ کے یہ احتمالات سہی لیکن مستقبل کے متعلق جو بکثرت خبریں دی گئیں۔ اور ایک کی بھی کوئی تکذیب نہ کر سکا ان میں بجز اس کے کہ اُس عالم الغیب والشہادہ کی طرف نسبت کیا جائے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ ط

الرُّوْحُ فِی الْقُرْاٰن

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط
قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا
اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ہ
وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْ
اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ
بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ہ اِلَّا رَحْمَةً
مِنْ رَّبِّكَ ط اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ
عَلَيْكَ كَبِيْرًا ہ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ
الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا

اور یہ لوگ آپ سے روح کو پوچھتے ہیں
آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم
سے بنی ہے - اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا
گیا ہے - اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر
وحی بھیجی ہے سب سلب کر لیں پھر اس کے لئے
آپکو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے مگر آپ
کے رب ہی کی رحمت ہے - بے شک آپ
پر اس کا بڑا فضل ہے - آپ فرما دیجئے اگر
تمام انسان و جنات سب اس بات کیلئے جمع

بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ
بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ
ظَهِيْرًا ۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ
فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ
فَاَبٰى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝
وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى
تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا ۝
اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ
وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا
تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ
تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝
اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ
زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ
وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى
تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ط
قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ

ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لاویں۔ تب بھی
ایسا نہ لا سکیں گے۔ اگرچہ ایک دوسرے کا
مددگار بھی بن جائے۔ اور ہم نے لوگوں کیلئے
اس قرآن میں ہر قسم کا عمدہ مضمون طرح طرح
سے بیان کیا ہے۔ پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کئے
ہوئے نہ رہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم آپ پر
ہرگز ایمان نہ لائیں گے جبتک آپ ہمارے لئے زمین سے
کوئی چشمہ جاری کر دیں یا خاص آپ کے لئے کھجور اور
انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو پھر اس باغ کے بیچ بیچ میں
جگہ جگہ بہت سی نہریں آپ جاری کر دیں یا جیسا کہ آپ کہا کرتے
ہیں آپ آسمان کے ٹکڑے ہم پر نہ گرا دیں۔ یا آپ اللہ
کو اور فرشتوں کو سامنے نہ لا کھڑا کر دیں
یا آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھر نہ ہو
یا آپ آسمان پر نہ چڑھ جائیں۔ اور ہم تو آپ
کے چڑھنے کو بھی کبھی باور نہ کریں۔ جب تک کہ
آپ ہمارے پاس ایک نوشتہ نہ لائیں۔ جس کو ہم بھی
پڑھ لیں آپ فرما دیجئے کہ سبحان اللہ میں بجز ایسکے

اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ؕ (پ ۱۵ ع ۱۰)	کہ آدمی ہوں پیغمبر ہوں اور کیا ہوں۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (پ ۱۵ ع ۱۰)

(اور سوال کرتے ہیں تجھ سے روح کی نسبت)

یعنی روح انسانی کیا چیز ہے، اس کی ماہیت وحقیقت کیا ہے؟ یہ سوال صحیحین کی روایت کے موافق یہود مدینہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزمانے کو کیا تھا۔ اور "سیر" کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں "قریش" نے "یہود" کے مشورہ سے یہ سوال کیا تھا۔ اسی لئے آیت کے "مکی" اور "مدنی" ہونے میں اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ نزول مکرر ہوا ہو، واللہ اعلم، یہاں اس سوال کے درج کرنے سے غالباً یہ مقصود ہوگا۔ کہ جن چیزوں کے سمجھنے کی ان لوگوں کو ضرورت ہے اُدھر سے تو اعراض کرتے ہیں۔ اور غیر ضروری مسائل میں ازراہِ تعنت وعناد جھگڑتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ وحی قرآنی کی روح سے باطنی زندگی حاصل کرتے اور اس نسخۂ شفا سے فائدہ اُٹھاتے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (شوریٰ رکوع ۵)	اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف فرشتہ (روح) اپنے حکم سے۔
يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ	اتارتا ہے فرشتوں کو بھید دے کر اپنے

اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے
مگر انہیں دور از کار اور معاندانہ بحثوں سے فرصت کہاں؟

روح کیا ہے، جوہر ہے یا عرض؟ مادی ہے یا مجرد؟ بسیط ہے یا مرکب؟ اس قسم کے غامض اور بے ضرورت مسائل کے سمجھنے پر نہ نجات موقوف ہے۔ نہ یہ بحیثیں انبیاء کے فرائض تبلیغ میں داخل ہیں، بڑے بڑے حکماء اور فلاسفر آج تک خود "مادہ" کی حقیقت پر مطلع نہ ہو سکے۔ روح جو بہر حال مادہ سے کہیں زیادہ لطیف و خفی ہے اس کی ماہیت و کنہ تک پہنچنے کی پھر کیا امید کی جا سکتی ہے۔ مشرکین مکہ کی جہالات اور یہود مدینہ کی اسرائیلیات کا مطالعہ کرنیوالوں کو معلوم ہے کہ جو قوم موٹی موٹی باتوں اور نہایت واضح حقائق کو نہیں سمجھ سکتی وہ "روح" کے حقائق پر دسترس پانے کی کیا خاک استعداد و اہلیت رکھتی ہو گی؂

تو کار زمین را نکو ساختی	کہ با آسمان نیز پرداختی

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ	کہدے روح میرے رب کے حکم سے ہے

موضح القرآن میں ہے کہ حضرت ؐ کے آزمانے کو یہود نے پوچھا سو اللہ تعالیٰ نے (کھولکر) نہ بتایا کیونکہ ان کو سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ آگے پیغمبروں نے بھی مخلوق سے ایسی باریک باتیں نہیں کہیں، اتنا جاننا

کافی ہے۔ کہ اللہ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آپڑی وہ جی اٹھا، جب نکل گئی وہ مرگیا

الفاظِ قرآنی کی سطح کے نیچے عمیق حقائق مستور ہیں

حق تعالیٰ کا کلام اپنے اندر عجیب وغریب اعجاز رکھتا ہے، روح کے متعلق یہاں جو کچھ فرمایا اس کا سطحی مضمون عوام اور قاصر الفہم یا کج رو معاندین کے لئے کافی ہے۔ لیکن اسی سطح کے نیچے، ان ہی مختصر الفاظ کی تہ میں روح کے متعلق وہ بصیرت افروز حقائق مستور ہیں۔ جو بڑے سے بڑے عالی دماغ، نکتہ رس فلسفی اور ایک عارفِ کامل کی راہِ طلب وتحقیق میں چراغِ ہدایت کا کام دیتی ہیں۔

"روح" کے متعلق عہد قدیم سے جو سلسلہ تحقیقات کا جاری ہے وہ آج تک ختم نہیں ہوا۔ اور نہ شاید ہو سکے۔ "روح" کی اصلی کنہ و حقیقت تک پہنچنے کا دعویٰ تو بہت ہی مشکل ہے۔ کیونکہ ابھی تک کتنی ہی محسوسات ہیں جن کی کنہ و حقیقت معلوم کرنے سے ہم عاجز ہیں۔ تاہم میرے نزدیک آیات قرآنیہ سے روح کے متعلق چند نظریات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔

روحِ قرآنی کے متعلق چند نظریات

(۱) انسان میں اس مادی جسم کے علاوہ کوئی اور چیز موجود ہے جسے "روح" کہتے ہیں۔ وہ "عالمِ امر" کی چیز ہے

اور خدا کے حکم سے فائض ہوتی ہے۔

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (بنی اسرائیل)

آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے

خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران ۵۶)

بنایا اُس کو مٹی سے پھر کہا اُس کو کہ ہو جا۔ پس وہ ہو گیا۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (المومنون)

پھر اٹھا کھڑا کیا اسکو ایک نئی صورت میں سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانیوالا ہے

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (نحل ۵۴)

ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم اُس کو کرنا چاہیں یہی ہے کہ کہیں اسکو ہو جا تو وہ ہو جائے

(۲) روح کی صفاتِ علم و شعور وغیرہ بتدریج کمال کو پہنچتی ہیں اور ارواح میں حصولِ کمال کے اعتبار سے بیحد تفاوت اور فرقِ مراتب ہے حتی کہ خدا تعالیٰ کی تربیت سے ایک روح ایسے بلند اور اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں دوسری ارواح کی قطعاً رسائی نہ ہو سکے۔ جیسے رُوحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہمارا اعتقاد ہے۔

محققین کہتے ہیں کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ میں امر کی اضافت رب کی طرف اور رب کی یاء متکلم کی طرف جس سے مراد نبی کریم صلعم ہیں اسی طرف مشیر ہے۔ کیونکہ امام راغبؒ کی تصریح کے موافق رب اُسی ہستی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو بتدریج حدِ کمال تک پہنچائے جہاں تک

پہنچنے کی اُس میں استعداد پائی جاتی ہو۔ چنانچہ دیکھ لو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ واکمل استعداد کے موافق اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسّی ومعنوی ہر حیثیت سے کسقدر بلند مقام پہ پہنچایا۔ آپ کو علوم ومعارف سے بھری ہوئی وہ کتاب مرحمت فرمائی جس کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ آپ فرما دیجئے اگر تمام انسان وجنات جمع ہو جاویں

اور حسّی طور پہ آپ کو شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ سے بھی اوپر لے گئے۔ جہاں تک کسی نبی یا فرشتہ کو عروج میسر نہ ہوا تھا۔

(۳) مگر روح کے یہ کمالات ذاتی نہیں، وہاب حقیقی کے عطا کئے ہوئے اور محدود ہیں۔ چنانچہ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا سے معلوم ہوا کہ علم کسی اور کا دیا ہوا ہے۔ اور جو علم تم کو دیا گیا وہ سب، دینے والے کے علم کے سامنے نہایت قلیل اور محدود ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (کہف)

تو کہہ اگر دریا سیاہی ہو کہ لکھے میرے رب کی باتیں بے شک دریا خرچ ہو چکے ابھی نہ پوری ہوں میرے رب کی باتیں اور اگرچہ دوسرا بھی لائیں ہم اس کی مدد کو

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ

اور اگر جتنے درخت ہیں زمین میں قلم ہوں اور سمندر ہو اس کی سیاہی اس کے پیچھے ہوں

سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ   سات سمندر نہ تمام ہوں باتیں اللہ

اللہ (لقمان) سات سمندر نہ تمام ہوں باتیں اللہ کی ۔

اسی طرح آگے مشرکین کے قول لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا الخ کے جواب میں قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا، فرمانا اس کی دلیل ہے۔ کہ علم کی طرح بشر کی قدرت بھی بہرحال محدود و مستعار ہے۔

(۴) روح انسانی خواہ علم و قدرت وغیرہ صفات میں کتنی ہی ترقی کر جائے یحتی کہ اپنے تمام ہمجنسوں سے گوئے سبقت لیجائے۔ پھر بھی اُس کی صفات محدود رہتی ہیں۔ صفات باری کی طرح لامحدود نہیں ہو جاتیں اور یہی بڑی دلیل اس کی ہے کہ روح خدا سے علیحدہ کوئی قدیم وغیر مخلوق ہستی نہیں ہو سکتی ورنہ تحدید کہاں سے آئی۔

(۵) کتنی ہی بڑی کامل روح ہو حق تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جب وقت چاہے اُس سے کمالات سلب کر لے گو اُس کے فضل و رحمت سے کبھی ایسا کرنے کی نوبت نہ آئے۔ یدل علیہ قولہ تعالیٰ :-

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا، اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ	اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر وحی بھیجی ہے سب سلب کر لیں۔ پھر اس کے لئے آپکو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے۔ مگر آپ کے

رَبِّكَ ، اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ؕ	رب کی ہی رحمت ہے - بے شک آپ پر اُس کا بڑا افضل ہے -

یہ چند اصول جو ہم نے بیان کئے اہل فہم کو نسق آیات میں ادنیٰ تامل کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں - صرف " عالم امر " کا لفظ ہے - جس کی مناسب تشریح ضروری ہے - اور جس کے سمجھنے سے اُمید ہے - کہ رُوح کی معرفت حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی

لفظ امر کی تشریح اور امر و خلق کا فرق

لفظ امر قرآن میں بیسیوں جگہ وارد ہوا ہے - اور اس کے معنی میں علماء نے کافی کلام کیا ہے لیکن ہماری غرض سورۂ اعراف کی آیت اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ کی طرف توجہ دلانا ہے - جہاں " امر " کو " خلق " کے مقابل رکھا ہے جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں - کہ خدا کے یہاں دو مد بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں - ایک " امر " دوسرا " خلق " -

دونوں میں کیا فرق ہے ؟ اس کو ہم سیاقِ آیات سے بسہولت سمجھ سکتے ہیں پہلے فرمایا اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ یہ تو " خلق " ہوا اور میان میں " استواء علی العرش " کا ذکر کر کے جو شانِ حکمرانی کو ظاہر کرتا ہے فرمایا یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ[1] یعنی ان مخلوقات کو ایک معین نظام پر چلاتے

---

[1] پوری آیت اور ترجمہ صفحہ (۱۹۲) پر درج ہے

رہنا جسے تدبیر و تصریف کہہ سکتے ہیں یہ "امر" ہوا - اسی طرح سورۂ طلاق میں ارشاد ہے :-

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَھُنَّ

اللہ وہ ہے جس نے بنائے سات آسمان اور زمین بھی اتنی ہی اترتا ہے - اُس کا حکم ان کے اندر -

گویا دنیا کی مثال ایک بڑے کارخانہ کی سمجھو جسمیں مختلف قسم کی مشینیں لگی ہوں، کوئی کپڑا بن رہی ہے - کوئی آٹا پیس رہی ہے، کوئی کتابیں چھاپتی ہے، کوئی شہر میں روشنی پہنچا رہی ہے کسی سے پنکھے چل رہے ہیں وغیرذالک، ہر ایک مشین میں بہت سے کل پُرزے ہیں - جو مشین کی غرض و غایت

؂ اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ یَطْلُبُہٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِہٖ ط اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

بے شک تمہارا رب اللہ جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین چھ دن میں پھر قرار پکڑا عرش پر، اُڑھاتا ہے - رات پر دن کو وہ اُس کے پیچھے لگا آتا ہے - دوڑتا ہوا اور پیدا کئے سورج اور چاند اور تارے تابعدار اپنے حکم کے، سُن لو اُسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا بڑی برکت والا ہے - اللہ جو رب ہے سارے جہان کا -

کالحاظ کر کے ایک معین اندازے سے ڈھالے جاتے اور لگائے جاتے ہیں۔ پھر سب پُرزے جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جاتا ہے۔ جب تمام مشینیں فٹ ہو کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تب الیکٹرک (بجلی) کے خزانہ سے ہر مشین کی طرف جُدا جُدا راستہ سے کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے۔

آن واحد میں ساکن و خاموش مشینیں اپنی اپنی ساخت کے موافق گھومنے اور کام کرنے لگ جاتی ہیں بجلی ہر مشین اور ہر پرزہ کو اُسکی مخصوص ساخت اور غرض کے مطابق گھماتی ہے۔ حتیٰ کہ جو قلیل و کثیر کہر بار وشنی کے لیمپوں اور قمقموں میں پہنچتی ہے۔ وہاں پہنچکر اُن ہی قمقموں کی ہیئت اور رنگت اختیار کر لیتی ہے۔

خلق" کیا ہے؟ اس مثال سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مشین کا ڈھانچہ تیار کرنا، اُس کے پرزوں کا ٹھیک اندازہ پر رکھنا، پھر فٹ کرنا ایک سلسلہ کے کام ہیں۔ جس کی تکمیل کے بعد مشین کو چالو کرنے کیلئے ایک دوسری چیز بجلی یا اسٹیم اس کے خزانہ سے لانیکی ضرورت ہے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے اول آسمان و زمین کی تمام مشینیں بنائیں۔ جس کو "خلق" کہتے ہیں، ہر چھوٹا بڑا پرزہ ٹھیک اندازہ کے موافق تیار کیا۔ . . . .

. . . . جس کو "تقدیر" کہا گیا ہے۔ قَدَّرَہٗ تَقْدِیْراً۔ سب کل پُرزوں کو جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جیسے

"تصویر" اور "تسویہ" کہتے ہیں خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ اور فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ یہ سب افعال خلق کی مد میں تھے۔

امر کیا ہے؟ | اب ضرورت تھی کہ جس مشین کو جس کام میں لگانا ہے، لگا دیا جائے مشین کو چالو کرنے کے لئے "امر الٰہی" کی بجلی چھوڑ دی گئی۔ شاید اس کا تعلق اسم "باری" سے ہے۔

اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ | وہ اللہ ہے بنانیوالا نکال کھڑا کرنیوالا صورت کھینچنے والا۔

فی الحدیث خلق الجنۃ وبرأ النسمۃ وفی سورۃ الحدید من قبل ان نبرأھا ای النفوس کما ھو مروی عن ابن عباس وقتادۃ والحسن۔

غرض اُدھر سے حکم ہوا "چل" فوراً چلنے لگی۔ اسی "امر الٰہی" کو فرمایا:۔

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ (یٰس) | اس کا حکم یہی ہے کہ جب کرنا چاہے کسی چیز کو تو کہے اس کو ہو۔ وہ اسی وقت ہو جائے۔

دوسری جگہ نہایت وضاحت کے ساتھ امر "کن" کو خلق جسد پر مرتب کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (آل عمران) بنایا اسکو مٹی سے پھر کہا اسکو کہ ہو جا وہ ہو گیا۔

تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں "کُنْ فَیَکُوْنُ" کا مضمون جتنے مواضع میں آیا ہے خلق ابداع کے ذکر کے بعد آیا ہے جس سے خیال گذرتا ہے کہ کلمہ "کن" کا خطاب خلق کے بعد مربوب میں تصرف و تدبیر کیلئے ہوتا ہوگا۔

مدح کا مبدء صفت کلام ہے | بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "امر" کے معنی یہاں "حکم" کے ہیں۔ اور وہ حکم یہی ہے جسے لفظ "کُنْ" سے تعبیر کیا گیا

اور "کن" جنس کلام سے ہے۔ جو حق تعالیٰ کی صفتِ قدیمہ ہے۔ جس طرح ہم اس کی تمامی صفات (مثلاً حیات، سمع، بصر وغیرہ) کو بلا کیف تسلیم کرتے ہیں۔ کلام اللہ اور کلمۃ اللہ کے متعلق بھی یہی مسلک رکھنا چاہیئے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ "روح" کے ساتھ اکثر جگہ قرآن میں "امر" کا لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ، وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا، یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ، یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ۔ اور پہلے گذر چکا کہ "امر" عبارت ہے۔ کلمہ "کن" سے یعنی وہ کلام انشائی جس سے مخلوقات کی تدبیر و تصریف اُس طریقہ پر کی جائے۔ جس پہ غرضِ ایجاد و تکوین مرتب ہو۔ لہذا ثابت ہوا کہ "روح" کا مبدء حق تعالیٰ کی صفتِ قدیمہ کلام ہے جو صفتِ علم و حیات کے ماتحت ہے۔ شاید اسی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ میں اُسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ کیونکہ "کلام" اور "امر" کی نسبت متکلم و آمر سے صادر و مصدور کی ہوتی ہے۔ مخلوق و خالق کی نہیں ہوتی۔ اسی لئے اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ میں "امر" کو "خلق" کے مقابل رکھا، ہاں یہ امر "کن" باری تعالیٰ شانہ سے صادر ہو کر ممکن ہے کہ "جوہر مجرد" کے لباس میں یا ایک "ملک اکبر" اور "روح اعظم" کی صورت میں ظہور پکڑے جس کا ذکر بعض آثار میں ہوا ہے۔ اور جسے ہم کہربائیہ روحیہ کا خزانہ کہہ سکتے ہیں۔

گویا یہیں سے روح حیات کی لہریں دنیا کی ذوالارواح پر تقسیم کیجاتی ہیں۔ اور الارواح جنود مجندۃ الخ کے بیشمار تاروں کا یہیں کنکشن ہوتا ہے۔

اب جو کرنٹ چھوٹی بڑی مشینوں کی طرف چھوڑا جاتا ہے۔ وہ ہر مشین سے اُس کی بناوٹ اور استعداد کے موافق کام لیتا اور اُس کی ساخت کے مناسب حرکت دیتا ہے۔ بلکہ جن لیمپوں اور قمقموں میں یہ بجلی پہنچتی ہے ان ہی کے مناسب رنگ و ہیئت اختیار کر لیتی ہے۔

روح کا مبدء صفت کلام ہے پھر وہ "جوہر مجرد" یا جسم لطیف کیونکر بن گئی؟

رہی یہ بات کہ "کُن" (ہو جا) کا حکم جو قسم کلام سے ہے، جوہر مجرد یا جسم نورانی لطیف کی شکل کیوں کر اختیار کر سکتا ہے، اسے یوں سمجھ لو کہ تمام عقلاء اس پر متفق ہیں کہ ہم خواب میں جو اشکال و صور دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ محض ہمارے خیالات ہوتے ہیں۔ جو دریا، پہاڑ، شیر، چیتے وغیرہ کی شکلوں میں نظر آتے ہیں

اب غور کرنے کا مقام ہے کہ خیالات جو اعراض ہیں اور دماغ کے ساتھ قائم ہیں وہ جواہر و اجسام کیوں کر بن گئے۔ اور کس طرح اُن میں اجسام کے لوازم و خواص پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ خواب دیکھنے والے سے بیدار ہونے کے بعد بھی یہ آثار و لوازم جدا نہیں ہوتے۔

خواب کی مثال سے مطلب کی تفہیم

فی الحقیقت خدا تعالیٰ نے ہر انسان کو خواب کے ذریعہ سے بڑی بھاری ہدایت کی ہے کہ جب ایک آدمی کی قوت مصورہ میں اس نے اس قدر

طاقت رکھی ہے کہ وُہ اپنی بساط کے موافق غیر مجسم خیالات کو جسمی سانچہ میں ڈھال لے اور اُن میں وہی خواص و آثار باذن اللہ پیدا کر لے جو عالمِ بیداری میں اجسام سے وابستہ تھے، پھر تماشہ یہ ہے کہ وہ خیالات خواب دیکھنے والے کے دماغ سے ایک منٹ کو علیحدہ بھی نہیں ہوئے۔ اُن کا ذہنی وجود بدستور قائم ہے، تو کیا اس حقیر سے نمونہ کو دیکھ کر ہم اتنا نہیں سمجھ سکتے۔ کہ ممکن ہے قادرِ مطلق اور مصوّرِ حق جل وعلا کا امر بے کیف (کُن) باوجود صفتِ قائمہ بذاتہ تعالیٰ ہونے کے کسی ایک یا متعدد صورتوں میں جلوہ گر ہو جائے۔ ان صورتوں کو ہم ارواح یا فرشتے یا کسی اور نام سے پکاریں۔

روح حادث ہے اور اس کا مبداء (امر رب) قدیم ہے

وُہ ارواح و ملائکہ وغیرہ سب حادث ہوں اور امرِ الٰہی بحالہ قائم رہے، امکان و حدوث کے احکام و آثار، ارواح وغیرہ تک محدود رہیں۔ اور "امر الٰہی" اُن سے پاک و برتر ہو جیسے جو صورت خیالیہ بحالت خواب مثلاً آگ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اُس صورت ناریہ میں احراق، سوزش، گرمی وغیرہ سب آثار ہم محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ اسی آگ کا تصور سالہا سال بھی دماغوں میں رہے تو ہمیں ایک لمحہ کیلئے یہ آثار محسوس نہیں ہوتے۔

ظاہر اور مظہر کے احکام جدا جدا ہیں

پس کوئی شبہ نہیں کہ روح انسانی (خواہ جوہر مجرد ہو یا جسم لطیف نورانی) "امر ربی" کا مظہر ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ

مظہر کے تمام احکام و آثار ظاہر پہ جاری ہوں کما ہو الظاہر۔ واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے لکھا اور جو مثالیں پیش کیں اُن سے مقصود محض تسہیل و تقریب الی الفہم ہے ورنہ ایسی کوئی مثال دستیاب نہیں ہو سکتی جو اِن حقائقِ غیبیہ پہ پوری طرح منطبق ہوسکے

اے بروں از وہم و قیل و قال من　　　خاک بر فرق من و تمثیل من

رہا یہ مسئلہ کہ روح جوہر مجرد ہے۔ جیسا کہ اکثر حکماء قدیم اور صوفیہ کا مذہب ہے۔ یا جسم نورانی لطیف جیسا کہ جمہور اہل حدیث کی رائے ہے اس میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے جو بقیۃ السلف بحر العلوم حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب طال اللہ بقاءہٗ نے فرمایا کہ بالفاظ عارف جامیؒ یہاں تین چیزیں ہیں۔

روح جوہر مجرد ہے یا جسم لطیف؟

(۱) وہ جواہر جن میں مادہ اور کمیت دونوں ہوں۔ جیسے ہمارے "ابدانِ مادیہ"

(۲) وہ جواہر جنہیں مادہ نہیں صرف کمیت ہے۔ جنہیں صوفیہ "اجسام مثالیہ" کہتے ہیں۔

(۳) وہ جواہر جو مادہ اور کمیت دونوں سے خالی ہوں۔ جن کو صوفیہ "ارواح" یا حکماء "جواہر مجردہ" کے نام سے پکارتے ہیں۔

پس جمہور اہل شرع جس کو "روح" کہتے ہیں وہ صوفیہ کے نزدیک "بدن مثالی" سے موسوم ہے جو بدنِ مادی میں حلول کرتا ہے اور بدن مادی کی طرح آنکھ، ناک، ہاتھ،

پاؤں وغیرہ اعضاء رکھتا ہے۔

روح کا بدن سے جدا ہونا موت کو مستلزم نہیں

یہ روح بدن مادی سے کبھی جدا ہو جاتی ہے۔ اور اس جدائی کی حالت میں بھی ایک طرح کا مجہول الکیف علاقہ بدن کے ساتھ قائم رکھتی ہے۔ جس سے بدن پر حالت موت طاری ہونے نہیں پاتی۔ گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول کے موافق جو بغوی نے

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا — اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا
وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا پ۲۴ ع۲ — اور جو نہیں مریں انکو کھینچ لیتا ہے انکی نیند میں۔

کی تفسیر میں نقل کیا ہے اُس وقت روح خود علیحدہ رہتی ہے۔ مگر اسکی شعاع جسد میں پہنچکر بقاء حیات کا سبب بنتی ہے جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے یا جیسا کہ حال ہی میں فرانس کے محکمۂ پرواز نے ہوا بازوں کے بغیر طیارے چلا کر خفیہ تجربے کئے ہیں اور تعجب انگیز نتائج رونما ہوئے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ حال میں ایک خاص بم پھینکنے والا طیارہ بھیجا گیا تھا جسمیں کوئی شخص سوار نہ تھا۔ لیکن لاسلکی کے ذریعہ سے وہ منزل مقصود پر پہنچایا گیا۔ اس طیارہ میں بم بھر کر وہاں گرائے گئے اور پھر وہ مرکز میں واپس لایا گیا۔ دعوی کیا جاتا ہے کہ لاسلکی کے ذریعہ سے ہوائی جہاز نے خود بخود جو کام کیا وہ ایسا ہی مکمل ہے جیسا کہ کسی ہوا باز کی مدد سے عمل میں آتا۔ آجکل یورپ میں جو سوسائٹیاں روح کی تحقیقات کر رہی ہیں انہوں نے بعض ایسے مشاہدات بیان کئے ہیں جنمیں روح جسم سے علیحدہ تھی اور روح کی ٹانگ پر حملہ کرنے کا اثر جسم مادی کی ٹانگ پر ظاہر ہوا۔

بہرحال اہل شرع جو "روح" ثابت کرتے ہیں صوفیہ کو اس کا انکار نہیں بلکہ وہ اسکے اوپر ایک اور روح مجرد مانتے ہیں جس میں کوئی استحالہ نہیں بلکہ اس روح مجرد کی بھی اگر کوئی اور "روح" ہو اور آخر میں کثرت کا سارا سلسلہ سمٹ کر "امر بی" کی وحدت پر منتہی ہو جائے تو انکار کی ضرورت نہیں۔

شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے "منطق الطیر" میں کیا خوب فرمایا

ہم زجملہ بیش وہم پیش از ہمہ　　　جملہ از خود دیدہ وخویش از ہمہ

جاں نہاں در جسم و او در جاں نہاں　　　اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں

روح ہر چیز میں ہے اور ہر چیز کو ایک حیثیت سے زندہ یا مردہ کہہ سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا تقریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر چیز میں جو "کن" کی مخاطب ہوئی روحِ حیات پائی جائے۔ بیشک میں یہی سمجھتا ہوں کہ مخلوق کی ہر نوع کو اس کی استعداد کے موافق قوی یا ضعیف زندگی ملی ہے یعنی جس کام کیلئے وہ چیز پیدا کیگئی ڈھانچہ تیار کر کے اس کو حکم دیا "کن" (اس کام میں لگ جا) بس یہی اسکی روح حیات ہے۔ جتنک اور جس حد تک اپنی غرض ایجاد کو پورا کریگی اسی حد تک زندہ سمجھی جائیگی اور جسقدر اس سے بعید ہو کر معطل ہوتی جائے گی اُسی قدر موت سے نزدیک یا مردہ کہلائے گی۔

یہ مضمون بہت طویل اور محتاجِ بسط و تفصیل ہے۔ ہمنے اہل علم و فہم کیلئے اپنی بساط کے موافق کچھ اشارے کر دیئے ہیں۔ شاید قرآن مجید پر نکتہ چینی کرنے والے اصحاب اتنا سمجھ لیں کہ روح کے متعلق بھی قرآن حکیم میں وہ رموز و حقائق بیان ہوئے ہیں جن کا عشر عشیر دوسری آسمانی کتاب میں بیان نہیں ہوا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وھو الملہم للصواب۔

عقل و نقل

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفےٰ مذہب اسلام اور فلسفۂ یونان میں جب جنگ ہوئی تو مسلمانوں نے علم کلام کے زبردست ہتھیاروں سے اُس کا قطعی فیصلہ کر دیا۔ اور اسلام کو ایسے مضبوط فصیلوں اور دمدموں سے محفوظ کیا جنکے مقابلہ میں اعلےٰ سے اعلےٰ قلعہ شکن توپیں بھی اپنا کوئی اثر نہ دکھلا سکیں۔

یہ کہنا بالکل مبالغہ سے خالی ہے کہ متکلمین نے مذہب کی سطح پر قائم کر حجت و استدلال کے متعلق جو کچھ اصول اور قواعد وضع کئے اُن سے تمام باطل توہمات کی قلعی کھل گئی۔ فلسفۂ یونان کی ملمع سازیوں کا طلسم ٹوٹا۔

معترضین کی ابلہ فریبیوں کا پردہ فاش ہوا - اور قیامت تک کیلئے مخالفین کی نکتہ چینیوں کا سدباب کر دیا گیا - لیکن افسوس کہ ہمارے زمانہ کے بعض کوتاہ نظروں کی تسلی اس پر بھی نہ ہوئی - اور وہ علم کلام کو آج کل کی ضروریات کے حق میں ناکافی ہی سمجھتے رہے -

ابھی کچھ عرصہ ہوا یورپ سے یہ صدا اٹھی کہ علومِ جدیدہ نے تمام مذاہب کی بنیادوں میں تزلزل پیدا کر دیا - اور مختلف ادیان عالم میں سے ایک مذہب بھی اُس کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکا -

جن لوگوں کو ہر بات کی تصدیق کے لئے یورپ کی وحی کا انتظار رہتا ہے - بے چون وچرا اس پر ایمان لے آئے اور ملک میں اس خیال کو اس قدر شہرت دی کہ اس سرے سے اُس سرے تک جابجا یہی چرچا ہو گیا - علماء نے یہ دیکھکر کہ عام لوگ مذہب سے بددل ہوئے جاتے ہیں - اس کی تحقیق کی طرف توجہ کی - مگر تفتیش کے بعد ثابت ہوا کہ اس دعویٰ میں واقعیت کا بہت ہی کم حصہ شامل ہے -

اس میں شک نہیں کہ علماء سائنس نے مادیات اور طبیعات کے متعلق بہت سی جدید باتیں دریافت کیں - علم ہیئت (علم الافلاک) میں مفید بیانات کا اضافہ کیا - صنعت و دستکاری کے عجیب وغریب کرشمے دکھلائے - روشنی اور بجلی وغیرہ کے متعلق جدید تحقیقات سے عالم کو

منور کر دیا۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں تبلایا کہ ان میں سے کون سی بات اسلام کے مخالف ہے یا کس چیز کے ثابت ہونے سے کسی اسلامی مسئلہ پر نقص وارد کیا جا سکتا ہے۔

فرض کرلو کہ عناصر کی تعداد ۶۷ سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ یہ بھی تسلیم کرلو کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے۔ یہ بھی مان لو کہ کواکب سیارہ سات میں منحصر نہیں مگر کیا اس سے توحید کے ثبوت میں کچھ خلل آیا۔ یا نبوت کا دعویٰ باطل ہو گیا۔ کسی آیت قرآنی کی مخالفت ہوئی یا حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیا گیا۔ جب ان میں سے کچھ بھی نہیں تو اب یہ دیکھو کہ علوم جدیدہ نے اسلامی مسائل کے متعلق رداً یا قبولاً کس چیز کی زیادتی کی۔

اس کے جواب میں اُن چند بوسیدہ اور پامال اعتراضات کے سوا کچھ نہیں کہا جاتا جو حدوث مادہ، ثبوت معجزات اور حشر و نشر وغیرہ کے متعلق عام طور پر زبان زد ہیں اور جن کو ہمارے زمانہ کے بعض آزاد خیال مؤلفین نے اردو زبان میں ذرا سلجھا کر تحریر کر دیا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے علم کلام کی تکمیل کو صرف شرح عقائد خیالی کے دائرہ میں محدود نہیں سمجھ رکھا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ علماء اسلام نے کہاں تک ان تمام شبہات کا رکیک اور بیجان ہونا ثابت کیا ہے اور کس

خوبی اور بسط کے ساتھ ان اعتراضات کا رد لکھا ہے۔ کاش میری اس تحریر کے پڑھنے والے ابن حزم ظاہری کی ملل ونحل، علامہ علاؤ الدین علی طوسی کی کتاب الذخیرہ، فاضل تفتازانی کی شرح مقاصد، امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ اور محققین فن کی نادر تصنیفات کا مطالعہ کریں۔ جس سے ان کے روبرو میرے اس بیان کی صداقت ظاہر ہو۔

اس بات کا کہدینا اُس کے ثابت کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ کہ علوم جدیدہ کی روشنی میں تمام قدیم علوم ماند پڑ گئے۔ اُس کے مقابلہ میں متکلمین کی تحقیقات بالکل بیکار ثابت ہو گئیں۔ اور اس کے دنیا میں آنے سے مذہب کو موت کا سامنا کرنا پڑا۔

کیا یہ دعوٰی کرنے والے ہمکو خاص اُن مضامین کی ایک فہرست دیکر ممنون بنا سکتے ہیں۔ جن کو اسلام اور متکلمین اسلام کے دلائل کے مخدوش بنانے میں کسی قسم کا دخل ہو اور جن کی صحۃ وسقم پر قدیم علم کلام نے بہت کافی طور پر بحث نہ کی ہو۔

ہماری ایسے لوگوں سے جو حال کے علماء کو جدید حملوں کی مدافعت سے عاجز بتلاتے ہیں۔ یہ التجا ہے کہ وہ ضرور ہمکو ایسے مسائل کی مع اُن کے دلائل کے ایک فرد تیار کر کے عنایت فرمائیں جن کا مقابلہ ہمارے بوڑھے اسلام سے نہ ہو سکا۔ اور آخر کار ہمارے سی۔ ایس۔ آئی بہادر

کو اُس کے ضعف اور پیرانہ سالی پر رحم کھا کر اس میں بہت کچھ اصلاح کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ تاکہ یہ ترمیم شدہ اسلام نوجوان یورپ کی نظروں میں وقیع اور باعظمت بن سکے۔ بہرحال۔ اپنی جہالت کیوجہ سے جس کا جو جی چاہے کہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ اسلامی عقاید کے متعلق متکلمین نے جس درجہ موشگافی باریک بینی اور فلسفیانہ نکتہ رسی سے کام لیا ہے۔ اُس نے ہمیشہ کیلئے ہم کو اندرونی اور بیرونی مخالفین اسلام پیچیدہ اعتراضات کے حل کرنے سے سبکدوش کر کے انکا ممنون احسان بنا دیا۔ اور میں جراءت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی دنیا میں امام ابوالحسن اشعری اور ابوالمنصور ماتریدی کے ایسے وکیل موجود ہیں۔ جو اسلامی معتقدات کے متعلق ان تمام شبہات کا استیصال کرتے ہوئے جو کسی نئے سے نئے پیرایہ میں ظاہر کئے جائیں۔ قدیم علم کلام کے کامل و مکمل ہونیکا ثبوت دے سکیں۔

ہم نے اپنے اُن دوستوں کو جو قدیم علم کلام کو اکثر ناقص بتلایا کرتے ہیں۔ بارہا یہ بھی کہتے سنا ہے کہ قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی۔ کیونکہ اُس زمانے میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراض کئے تھے۔ عقائد ہی کے متعلق تھے۔ لیکن آجکل تاریخی اخلاقی تمدنی ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے۔ یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے عقاید اس قدر قابل اعتراض نہیں جسقدر اُس کے قانونی اور اخلاقی مسائل ہیں اُن کے نزدیک

تعدد نکاح، طلاق، غلامی، جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا اُس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس بنا پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنا ضروری ہے۔ اور یہ حصہ بالکل قدیم علم کلام میں موجود نہیں۔ ہمارے ان احباب کا یہ کہنا بالکل سچ ہے۔ کہ قدیم علم کلام کا تعلق صرف عقاید سے ہے۔ قانونی اور اخلاقی مسائل سے اُس میں مطلقاً بحث نہیں کیگئی۔ لیکن متکلمین یہ نہ کرتے تو کیا کرتے۔ علم کلام کا مقصد ہی عقائد تک محدود تھا۔ قانونی اور اخلاقی مباحث کیلئے اُس کی وضع ہی نہ تھی۔ ان چیزوں کیلئے دوسرے علوم کی حاجت تھی۔ چنانچہ فن تصوف واخلاق اور علم اسرار الدین نے اس ضرورت کو بھی رفع کیا۔ اور اسلام کی تمام جزئیات نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، جنگ وجہاد کے مخفی اسرار اور حکمتوں کو نہایت تفصیل کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قیمتی تصنیفات اس وقت بھی کثرت سے موجود ہیں۔ جنکے مطالعہ سے میرے اس بیان کی پوری تصدیق ہو سکتی ہے۔ اور اس عنوان کے ذیل میں جس سلسلہ مضامین کے لکھنے کا میں ارادہ کر رہا ہوں۔ اُس میں اس کا خیال رکھونگا۔ کہ حسب موقع ان بیش بہا تصانیف سے مفید اقتباسات حاصل کروں۔

بہرکیف علم کلام جس غرض کی تکمیل کے لئے مدوّن کیا گیا۔ میرے نزدیک

اُس نے اُس میں پوری کامیابی حاصل کی اور اب میرا قصد ہے کہ میں اسلامی عقاید کے ہر باب کے متعلق بصورت رسائل عدیدہ یہ دکھلاؤں۔ کہ علماء اسلام نے اس کو تحقیق کی۔ کس حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے۔ اور اب ہم کو اُس میں کہاں تک ترمیم یا اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن مجھ کو اپنے اصلی مقصد کے شروع کرنیسے پہلے جیسا کہ چند اُن مقدمات کا ذکر کر دینا ضروری ہے جن کے بغیر ہمارا مقصد کامل طور پر اور آسانی کے ساتھ دل نشین نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح بعض دراں خطرناک غلطیوں پر مطلع کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو اُصول کے طور پر عام مسلمانوں میں تسلیم کر لی گئی ہیں۔ اور جو آگے چلکر ہمارے ناظرین کو بعض اصلی مقاصد کے سمجھنے میں مزاحم ہو سکتی ہیں۔

لیکن جس اہم کام اور طویل الذیل سلسلہ کا میں نے بیڑا اٹھایا ہے اور جس کا آغاز بنام خدا آج اس رسالہ سے کیا جاتا ہے۔ وہ اُسی وقت انجام کو پہنچ سکتا ہے۔ جبکہ اس مضمون کے پڑھنے والے کلمات خیر سے میری ہمّت بڑھائیں اور خدا کی توفیق شامل حال رہے اور عجب نہیں کہ اگر اس ناچیز مضمون کا کوئی حصہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تو پھر ہمکو قدیم و جدید ہیئت کے مسائل کے موازنہ کرنے کی بھی اپنے دسترس کے موافق جرأت ہو اور اگر زندگی ہے تو انشاءاللہ ہم علوم جدیدہ کے متعلق اپنی معلومات بڑھانیکی کوشش اور اس مقصد کی تکمیل کی ضرور فکر کریں گے۔

اے لبِ آرزو کہ خاک شدہ ‏ ‏ ‏ ‏ در بمبیرم عذر ما بپذیر

اس سے قبل کہ توحید، رسالت اور جزا و سزا وغیرہ اسلامی اصولوں میں سے ہر ایک اصول کی علیحدہ علیحدہ رسائل کے ذریعہ سے بلا شائبہ تعصب مفصل تحقیقات کی جائے اس ایک رسالے میں چند ایسے امور کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو اُن مباحث میں امداد دینے کے علاوہ اس موقع پہ ایک خاص قسم کی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ امور در حقیقت ایسے قوانین ہونگے جن کی صحت اُن محسوسات اور بدیہیات پہ مبنی ہو گی۔ جو ہر طرح سے قابل اطمینان ہیں۔ اور انہی سچے قوانین کی میزان سے ہم آیندہ چلکر اسلامی مسائل کی پوری پوری جانچ کر سکیں گے۔ گویا یہ مقدمات ہمارے نزدیک اُن اصول موضوعہ کے طور پہ لکھے جائیں گے۔ جن کے سہارے ہمارے اکثر بیانات کی بنیادیں قائم ہونگی۔

اب اگر کسی صاحب کو ان میں سے کوئی اصول مشتبہ یا غلط نظر آئے تو وہ بہت شوق کے ساتھ اپنے اعتراض کو ظاہر فرما دیں۔ لیکن اپنے کسی ایک دعویٰ کے ثبوت میں بھی چند کہنہ سال یورپین کا نام لینے پہ اکتفا نہ کریں۔ تا وقتیکہ اُن کے پاس ایسی ہی کوئی دلیل قطعی نہ ہو۔ جیسا کہ ہم اپنے ہر ایک دعویٰ کیساتھ ساتھ پیش کریں گے یا جیسی دلائل تو یہ کا وہ ہم سے خود مطالبہ فرمانے کو تیار ہونگے۔ اور اگر وہ صاحب صرف چند جرمنی اور فرانسیسی مصنفین

کے اقوال یاد کر لینے ہی کو علوم جدیدہ میں ماہر ہونا تصور کرتے ہوں۔ تو بحمد اللہ ایسے مباحث سے بھی گو ہم اپنے کو عاجز نہیں پاتے۔ مگر جب ایسے دور از کار فضولیات کا منظر سامنے ہوگا۔ تو ہماری طبیعت بھی صرف اسی قدر جواب کو پسند کریگی کہ

مدعی گو برو و نکتہ بحافظ مفروش کلک ما نیز زبانے و بیانے دارد

اسلئے ایسے لوگوں کی خدمت میں ہم عرض کئے دیتے ہیں۔ کہ وہ براہ کرم اپنا اور ہمارا عزیز وقت ہرگز ضائع نہ فرمائیں۔ بلکہ ذرا سی دیر کیلئے سخن پروری ہٹ دھرمی اور نفس پرستی کو فراموش کر کے اور آخرت کی عام جوابدہی کو پیش نظر رکھکر ٹھنڈے دل سے اُن قیمتی مطالب کے سُننے میں مصروف ہو جائیں جو بڑی عرق ریزی کے بعد جمع ہو کر بنی نوع انسان کی ہمدردی کی خاطر منظر عام پر لائے جائیں گے۔

اب ان تمام ہدایات کے بعد ہم اپنا اصلی مطلب شروع کرتے ہیں اور آرزومند ہیں کہ اس کے پڑھنے والے تمام پرانے وساوس اور اوہام سے دل کو پاک کر کے اور لاتنظر الی من قال وانظر الی ما قال کو سامنے رکھکر نیک نیتی اور انصاف پرستی کی داد دینے کیلئے آمادہ ہو جائیں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

شاہا من ار بعرش رسانم سر بہ فضل مملوک این جنابم و مسکین این درم

العقل والنقل

تمام اہل فہم کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہے۔ کہ نقل صحیح یا عقل کامل کا اتباع انسان کے اولین فرائض میں سے ہے۔ اور انہی دونوں کی اطاعت پر اس کے برگزیدہ کمالات اور حقیقی کامیابیوں کے حاصل ہونیکا انحصار ہے۔ پھر ہرچند کہ اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں حاکموں (عقل و نقل) میں کبھی نزاع اور خصومت بجز اس کے ممکن نہیں۔ کہ یا نقل کی صحت مشکوک ہو یا عقل کی سلامتی میں کچھ نقصان اور فتور واقع ہو جائے مگر جب کبھی کسی وجہ سے کسی موقع پر ان دونوں میں خلاف محسوس ہوتا ہے تو انسان کے خیالات میں سخت مزاحمت اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں جانبوں کی کھینچ تان سے اس کو دشواری پیش آتی ہے کہ وہ ان میں کس کے حکم کو قبول اور کس کو رد کرے اگر دونوں کی تعمیل کرنا چاہے تو اس کی کیا صورت ہو۔ اور کسی ایک کو ترجیح دے تو کیونکر دے؟

اس لئے سب سے پہلے مگر سب سے مشکل منزل (جس کے طے کئے بغیر ہم اپنے اصلی مدعا تک نہیں پہنچ سکتے) یہ ہے کہ عقل و نقل کا یہ قدیم جھگڑا چکایا جائے۔ جس کی بدولت پچھلے زمانہ میں سینکڑوں دانشمند آدمیوں کی قربانی ہو چکی ہے۔ اور بہت سے بے قصور لوگ دار پہ کھینچ دیئے گئے ہیں جب کبھی مدعیان عقل نے قدم جمائے اہل نقل کے استیصال میں تسمہ

باقی لگا نہیں رکھا، اور جب نقل کے بیوقوف پیرؤوں کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے بھی اپنے فریق مقابل کے حق میں سر قلم کرنے یا آگ میں جلا دینے سے کم کوئی سزا تجویز نہیں کی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس اختلاف عقل و نقل کی اصلی حقیقت کیا ہے کیا اس خوفناک نزاع میں کوئی صحیح صورت تطبیق کی ممکن ہے۔ یا کسی اہل مذہب نے ان دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ کیا ان تطبیق دینے والوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اپنی سعی میں کامیاب ہوا۔

یہ وہ سوالات ہیں جن پہ غور کرنا ہر ایک مذہب والے کا فرض ہے۔ اور اس وقت ہم انہی اہتم بالشان امور پر کامل طریقہ سے ایسے آسان پیرایہ میں بحث کریں گے۔ جس میں عام خاص عالم۔ جاہل اور ذکی۔ غبی سب مساوی طور پہ حصّہ لیں۔

قدیم سے قدیم روایات پہ عبور کرنے سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ عقل و نقل کی یہ نزاع اور باہمی کشمکش کسی ایک قوم، ایک ملک اور ایک ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ انسانی آبادی کے ہر طبقہ اور ہر حصّہ میں دونوں قسم کی طبیعتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ جو زمانہ کسی قوم کے حق میں اعلےٰ درجہ کی وحشت بدویت اور عام تاریکی کا فرض کیا جائے۔ اُس میں بھی متمدن اقوام کی مانند دونوں طرح کے خیالات پائے جاتے

ہیں بعض لوگ اپنی عقل کے ایسے پابند اور خیالات کے ایسے محکوم ہوتے ہیں کہ جو چیز اُن کی عقل و ادراک سے خارج ہو اُس کو وہ واقع میں موجود ہی نہیں سمجھتے اور ان کے برخلاف بعضوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے کسی نسبی بزرگ یا مذہبی مقتدا سے کوئی بات سن لیں تو بے چون و چرا اُن کے حکم کے سامنے گردن ڈالدیں۔ بشرطیکہ اُس مقتدا کے مقتدا ہونے پر اُن کو پورا اعتماد حاصل ہو چکا ہو۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں میں طعن و تشنیع کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پہلا گروہ دوسرے کو سادہ دل۔ کم عقل اور بے وقوف سمجھتا ہے اور دوسرا پہلے کو بے ادب۔ مغرور اور نافرمان قرار دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں کینہ اور بغض کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور زبان و دل سے گذر کر ہاتھ پاؤں تک جنگ و جدل کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر اس پر بھی امر متنازع فیہ کا تصفیہ نہیں ہوتا۔ بلکہ طرفہ ماجرا یہ ہے۔ کہ بسا اوقات ایک ہی شخص اور ایک ہی کتاب کے دو قول اس مسئلہ میں متناقض پہلو رکھتے ہیں۔ اور ہماری حیرت اور تعجب کی اُس وقت کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جب ہم کو کسی ایک ایسی مذہبی کتاب میں جو کسی فرقے کے نزدیک خطاؤ قصور سے بالکل پاک تسلیم کر لی گئی ہے۔ وہ متعارض کلام اس بارے میں نظر پڑتے ہیں۔ جب ہم موسیٰ علیہ السلام

کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں۔ تو امثال سلیمان کے تیسرے باب میں یہ عبارت لکھی ہوئی ملتی ہے:۔

"اپنے سارے دل سے خداوند پر توکل کر، اور اپنی سمجھ پر تکیہ مت کر اپنی ساری راہوں میں اس کا اقرار کر، وہ تیری رہنمائی کرے گا اپنی نگاہ میں آپکو دانشمند مت جان۔ خداوند سے ڈر، اور بدی سے باز رہ یہ تیری ناف کیلئے صحت اور تیری ہڈیوں کے لئے تراوٹ ہے۔"

اور انہی امثال کے آٹھویں باب میں لکھا ہے کہ:۔

"کیا دانائی نہیں پکارتی اور کیا فہمید آواز بلند نہیں کرتی وہ سڑک کے پاس اونچے مقاموں کی چوٹیوں پر اور چوراہے کے چبوترے پہ کھڑی ہوتی ہے وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے مدخل پر جہاں سے دروازوں میں داخل ہوتے ہیں۔ چلاتی ہے کہ اے آدمیو میں تمہیں بلاتی ہوں۔ اور بنی آدم کی طرف اپنی آواز اٹھاتی ہوں اے بیوقوفو خرد کو سمجھو اور اے جاہلو! سمجھنے والا دل پیدا کرو۔ سنو کہ میں لطیف مضمون کہتی ہوں اور میرے لبوں سے جب وہ کھلتے ہیں تو سچی باتیں نکلتی ہیں۔ کہ میرا منہ سچ کہتا ہے۔ اور میرے لبوں کو شرارت سے نفرت ہے میرے منہ کی ساری باتیں صداقت

سے ہیں اُن میں کچھ ٹیڑھا، ترچھا، نہیں وہ سب اُس کے نزدیک جو دانش رکھتا ہے۔ سیدھے ہیں اور ان کے خیال میں جو حقیقت شناس ہیں راست ہیں ؛؛

اسی قسم کے متضاد بیانات انجیل مقدس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کسی جگہ اپنی عقل پہ خدا کی بندگی کا دارو مدار رکھا ہے۔ اور کہیں انسانی عقل، انسانی حکمت اور انسانی ادراک کو بالائے طاق رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

پاؤل رسول نے جو خط رومیوں کو لکھا ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"غرض میں اپنی عقل سے خدا کی شریعت اور جسم سے گناہ کی بندگی کرتا ہوں[1]"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کی شریعت کا اتباع وہ اپنی عقل کے بھروسہ پر کرتے تھے۔ لیکن اس کے خلاف انہی پاؤل رسول نے جو خط کرنتیوں کو تحریر کیا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے :۔

" اور میری عبارت اور میرا وعظ انسانی حکمت کے دلفریب بات کے ساتھ نہیں لیکن رُوح اور قدرت کی دلیل کے ساتھ تھا تاکہ تمہارا ایمان نہ انسانی حکمت سے بلکہ خدا کی قدرت سے ثابت ہووے ہم کاملوں کے نزدیک حکمت کی بات بولتے ہیں۔ مگر اس جہان کی اور اس جہان کے فانی حاکموں کی حکمت نہیں بولتے بلکہ ہم وہ حکمت الٰہی بولتے ہیں جو چھپی ہوئی ہے

---

[1] دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۲۹۸

یعنی وہ پوشیدہ حکمت جسے خدا نے زمانہ کے آگے ہماری بزرگی کے لئے مقرر کیا تھا۔"

پھر اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ :-

"اب ہم نے نہ دنیا کی روح بلکہ وہ روح جو خدا سے ہے پائی تاکہ ہم اُن رازوں کو جو خدا نے ہمیں بخشے ہیں۔ سمجھیں اور ہم اُن رازوں کو انسان کی سکھلائی باتوں سے نہیں بلکہ روح قدس کی سکھلائی ہوئی باتوں سے غرض روحانی چیزوں کو روحانی عبارت سے ملاکر بیان کرتے ہیں۔ مگر نفسانی آدمی خدا کی روح کی باتوں کو قبول نہیں کرتا کہ اس کے نزدیک نادانی کی باتیں ہیں اور وہ ان کو سمجھ نہیں سکتا کہ وے روحانی طور سے بوجھی جاتی ہیں"

شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی دونوں قسم کے مضامین موجود ہیں۔ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگ درجات عقل کے موافق جنت میں داخل ہونگے۔ اہل الجنۃ بلہٗ (یعنی اکثر جنتی لوگ بیوقوف ہونگے) بھی مشہور ہے۔

آپکے بعد جو علماء اور حکما آپ کی اُمت میں گذرے ان کے اقوال بھی اسی طرح بظاہر متعارض رہے۔ اور امام غزالی کے زمانہ تک غالباً بہت کم عالم ادہر متوجہ ہوئے جنہوں نے اس عقل ونقل کے اختلاف

لہ دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۵۲۸

پر باضابطہ اور مکمل بحث کی ہو اور تمام شبہات کو رفع کر کے یہ دکھا دیا ہو کہ اس اختلاف کا اصلی منشا کیا ہے۔ دونوں فریق کے استدلالات کس درجہ تک درست ہیں۔ اور انبیاء یا اکابر علما کی کتابوں میں جو بظاہر اختلافات معلوم ہوتے ہیں۔ جن کی طرف ہم نے بھی اشارہ کیا ہے ان کے اجتماع اور تطبیق کی صحیح صورت کیا ہے۔

میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ امام غزالی سے پہلے کوئی شخص عقل و نقل کی تطبیق کی صورت سمجھے ہوئے نہ تھا۔ بلکہ یہ غرض ہے کہ ان سے پہلے اس مسئلہ کی خاص تشریح کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ ہر ایک زمانہ کے حکما الٰہی امور کے بیان میں زیادہ تاکید و تفصیل سے کام لیا کرتے ہیں۔ جن میں کسی قسم کے خفا اور مغالطہ کا اندیشہ ہو یا وہ ایسے امراض ہوں جن کے اندر عام طبائع مبتلا پائی جائیں۔

تم خود اندازہ کر لو کہ والدین کی اطاعت اور اولاد پر ترحم اور شفقت یہ دونوں چیزیں باوجودیکہ مذہبی ضروریات میں سے ہیں مگر اول چونکہ ایک گونہ نفس کی خواہش کے خلاف اور دوسرے نہ تنہا انسان بلکہ تمام حیوانات کی اقتضائے طبیعیہ میں سے ہے اس وجہ سے حکیم مطلق نے حقوق والدین کی خرابی اور ان کی اطاعت کی خوبی کو بکرات و مرات اور باجمال و تفصیل جس قدر مختلف عنوانوں

سے تعلیم فرمایا ہے (حمد علی الا ولاد کے احکام میں اُس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

ٹھیک اسی طرح علماء سلف کے زمانہ میں چونکہ عام طور پر مذہبی روایات کا اعتماد قائم تھا۔ اور زید، عمرو بکر کی رائے اور خیال سے ان روایات کا بدل ڈالنا کسی اہل مذہب کے نزدیک بھی روا نہ تھا۔ اس لئے نہ عقل و نقل میں بکثرت نزاعات قائم ہوتے تھے نہ علماء کو ان دونوں کے مقدمات فیصل کرنے کی نوبت آتی تھی۔ اور نہ اس کی حاجت سمجھی جاتی تھی۔ کہ ان دونوں کی تطبیق کے اصول یا اختلاف کے اسباب بیان کئے جائیں۔

اس کے بعد جوں جوں زمانہ گذرا۔ فلسفیت اور الحاد کا رنگ غالب آیا۔ عقول ناقصہ جزئیہ کی گرم بازاری ہوئی اور نقل کی قدر و منزلت گھٹی اسی قدر عقل و نقل کی منازعت بڑھتی گئی۔ اور امام غزالی کے زمانہ تک اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان دونوں (عقل و نقل) کی موافقت واتحاد کے واسطے کچھ آئین بتلائے جائیں اور ان میں سے ہر ایک کے حدود کی تعین وضاحت کیساتھ کر دی جائے چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اُس پر قلم اٹھایا اور انصاف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ کی ضروریات کے موافق اس مقصد کی پوری

تکمیل کردی۔

لیکن چونکہ علماء سلف کو اس تعیین و تفصیل کی حاجت پیش نہیں آئی تھی اور علماء مابعد نے امام صاحب ممدوح کی تشریحات پر حوالہ کر دینے کو کافی سمجھا۔ اسواسطے ان سے پہلے اور اُن کے بعد اکثر ایسے ہی مبہم اور متعارض اقوال عقل و نقل کے بارے میں جمع ہوتے رہے۔ جس سے آجکل کے کوتاہ نظروں کو سادہ لوح عوام کے گمراہ کرنے کا خوب موقعہ ہاتھ آیا اور انہوں نے بزرگوں کے کلام کے وہ مختلف ٹکڑے جن کو امام غزالی نے احیاء العلوم وغیرہ میں عمدہ طور پر جمع کر کے دکھلا دیا تھا۔ جابجا اپنے استشہاد میں پیش کر کے سیدھے اور سچے مسلمانوں کو طریق حق سے ہٹانا چاہا۔ چنانچہ اب میں اس قسم کے اکثر کلام حکماء اور علماء اسلام کی کتابوں سے انتخاب کر کے ذیل میں نقل کرتا ہوں جن کو پڑھکر ایک خالی الذہن آدمی سخت تحیّر اور تذبذب میں پڑ جاتا ہے۔ اور اس کے بعد امام غزالی کی مفصل تقریرات کی متفرق۔ تصانیف سے اقتباس کر کے ہدیۂ ناظرین کروں گا۔ جو اس حیرت اور پریشانی کو کافی حد تک مٹا سکے گی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عقل و نقل کی جو مخالفت آجکل دیکھنے میں

آرہی ہے کہ عرصہ ہوا دونوں حکومتوں میں سفراء اٹھا چکے۔ اور اعلان جنگ ہو کر لگاتار معرکہ آرائی ہونے لگی۔ پھر لڑائی بھی باقاعدہ نہیں۔ بلکہ زمانہ حال کی عقل نے غدر پر کمر بستہ ہو کر محض جابرانہ کارروائی شروع کر دی۔ چونکہ یہ بہار یا خزاں نہ امام غزالی نے دیکھی تھی، اور نہ اُن سے پہلے کسی اور نے اس لئے اگر زمانۂ حال کی بعض خصوصیات پر نظر کر کے امام غزالی کی تقریر میں بھی کوئی کمی ہو گی تو میں اُسکو آزادانہ ظاہر کرونگا اور پھر کسی اور عالم کی تقریر اگر اُن کی تقریر سے زیادہ تسکین بخش سمجھی جائے گی۔ تو اُس کو سب سے آخیر میں درج کرونگا۔ تاکہ ہمارے رسالہ کے وہ ناظرین بھی جنکے دلوں میں اس زمانہ کی اندیشہ ناک آزادی کا کوئی اثر آیا ہو۔ اوّل سے آخر تک تمام آراء کا موازنہ کر کے نیکدلی کے ساتھ سچائی اور راستی کو قبول کر سکیں۔ وللہ در من قال ؎

دورِ مجیب گردش این دائرہ را | فیتی است که گردون بگیه او دوران را
اکنون اثر تربیت دہر بر آن است | تا صورت خیر چہر دہد نطفہ کان را
بر خاستہ زین شورہ زمین چند بخارے | یکسر بکف غول ہوا داد عنان را
سیمرغ خرد و قوت پرواز مگس نیست | بال و پر این میچدان ہمہ دان را

سب سے پیشتر ہم اُن حامیان عقل کی طرف رجوع کرتے ہیں جو عام طور پر فلاسفۂ اسلام یا حکماء اسلام کے لقب سے مشہور ہیں اور جن کی زندگی

کا اکثر حصہ عقل کی پیروی میں صرف ہوا ہے۔ شیخ بو علی سینا اور ابن رشد اندلسی اس گروہ کے بہت بڑے امام گذرے ہیں۔ شیخ نے اشارات کے آخر میں ایک مستقل باب اسکے لئے منعقد کیا ہے۔ کہ انبیاء اور اولیا کے بہت سے علوم میں ممکن ہے کہ عقول متوسط کے مرتبہ سے بالاتر ہوں۔ وہ درحقیقت صحیح ہوں مگر عام طور پر لوگ اُن کو نہ سمجھ سکیں۔ کیونکہ جو چیز انسان میں علوم اور ادراکات کی حاصل کرنیوالی ہے وہ ایک لطیف چیز ہے۔ جس کو رُوح سے تعبیر کرتے ہیں اور جب علم کے حاصل ہونے کا مبنیٰ وہ ہی چیز لطیف ٹھہرا تو جس قدر جسم کی کثافت کو بذریعہ مجاہدات اور ریاضات کے زائل کیا جائیگا۔ اُسی قدر روح کی لطافت میں ترقی ہوگی۔ اور لطافت کے بڑھنے سے علوم میں یقیناً وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔

چونکہ انبیاء اور اولیا بھی ترک لذات اور کسر شہوات کے بعد جسمانی تعلقات سے بہت کچھ بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ان کو بہت سی وہ باتیں معلوم ہوں جو ہمکو نہ ہوں تو یہ کوئی قابل استعجاب امر نہیں ہے۔ اس کے بعد شیخ کہتا ہے:-

والعارفون المتنزهون اذا وضع عنهم درن مقارنته البدن وانفكوا عن الشواغل	اور خدا کی معرفت رکھنے والے پاک بندے جس وقت ان سے جسمانی تعلق کا بار ہلکا کر دیا جاتا ہے اور دنیوی مشاغل سے وہ علیحدہ

خلصوا الی عالم القدس والسعادة
وانتقشوا بالکمال الاعلیٰ و
حصلت لهم اللذة العلیا وقد
عرفتها ولیس هذا الالتذاذ
مفقودًا من کل وجهٍ والنفس
فی البدن بل المنغمسون فی
تامل الجبروت المعرضون عن
الشواغل یصیبون وهم فی
هذه الابدان من هذه اللذة
حظًا وافرًا قد یتمکن منهم
فیشغلهم عن کل شئ[1]۔

ہو جاتے ہیں تو انکی توجہ خالص طور پر عالم قدس اور
عالم سعادۃ کیطرف مبذول ہو جاتی ہے اور اعلیٰ درجے
کمال کے ساتھ موصوف اور بڑی لذت اٹھانیوالے
ہوتے ہیں جیسا کہ تم پہلے معلوم کر چکے ہو۔ اور یہ
نہیں کہ جب روح بدن میں ہو۔ تو وہ اس لذۃ سے
بالکل محروم رہیں۔ بلکہ ایسے لوگ جو خدا کی عظمت
و جبروت کی فکر میں ڈوبے ہوئے اور جسمی مشغول
سے اعراض کرنے والے ہیں۔ وہ ان
اجسام میں رہ کر بھی اس لذۃ سے اتنا بڑا
حصہ پالیتے ہیں جو ان پر غالب آکر تمام
اشیاء سے ان کو فارغ کر دیتا ہے۔

شرح اشارات محقق طوسی میں ہے:۔

جل جناب الحق تعالیٰ ان یکون
شریعة لکل وارد او یطلع علیه
الا واحد بعد واحد ولذلك
فان ما یشتمل علیه هذا الفن
ضحکة للمغفل وعبرة للمحصل

خدائے تعالیٰ کی جناب اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے
کہ وہ ہر وارد و صادر کی گذرگاہ بنجائے یا اس پر
مخصوص افراد کے سوا کوئی مطلع ہوسکے اور اسی
وجہ سے صوفیوں کا طریقہ غافل کے نزدیک
مضحکہ خیز اور طالب کے واسطے عبرت انگیز طریقہ ہے

[1] منقول از شرح اشارات امام رازی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۵

فمن سمعه فاشمأز عنه
فليتهم نفسه لعلها لا تناسبه
وكلٌّ ميسّر لما خلق له المراد
ذكر قلة عدد الواصلين
الى الحق والاشارة الى ان
سبب انكار الجمهور للفن المذكور
فی هذا النمط هو جهلهم
بها فان الناس اعداء ما
جهلوا والی ان النوع من
الکمال لیس مما یحصل
بالاکتساب المحض بل انما
یحتاج مع ذالك الی جوهر
مناسب له بحسب الفطرة [1]

توجہ اُن کی باتوں کو سنکر اُن سے اعراض کرے اسکو چاہیئے کہ وہ اس بارے میں اپنے نفس کا قصور سمجھے۔ کیونکہ اس کو اُن سے مناسبت نہیں ہے اور ہر شخص کیواسطے وہی بات آسان ہوتی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا رسیدہ لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اور اکثر لوگ باطنی طریقوں سے اس بنا پر انکار کرتے ہیں کہ وہ اس کو نہیں جانتے۔ آدمی ہمیشہ نامعلوم باتوں کا دشمن ہوتا ہے۔ پھر یہ کمال ہر ایک کو محض حاصل کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ اس کا جوہر طبیعت فطرۃ اس کے مناسب نہ ہو۔

ان دونوں عبارتوں سے شیخ اور علامہ طوسی کا یہ مطلب ہے۔ کہ اگر انبیاء اور اولیاء سے بعض ایسے امور منقول ہوں۔ جو ہماری عقل کے دائرہ سے باہر ہیں تو ہمکو ان کی اس بنا پر تصدیق کرنا چاہیئے۔ کہ ان کے نفوس بہیئت

[1] - شرح اشارات طوسی مطبوعہ مصر صفحہ ٣٩ ١٢ منہ

کی ظلمات اور بشریت کی کدورت سے پاک وصاف ہوتے ہیں۔ اور ہمکو یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن شیخ کی اس تقریر سے اس کا کوئی جواب نہیں نکلا کہ اس صورت میں ہندوستان کے جوگی، نصاریٰ کے راہب اور پہلا زمانہ کے اشراقیوں کے تمام علوم کیوں قابل تسلیم نہیں ہیں۔ جبکہ روحانیت کی ترقی کا مدار تجرد اور ترک دنیا پر ہو تو ان لوگوں کا تجرد انبیاء اور اولیاء کے تجرد سے کیوں کم ہے۔ بلکہ بظاہر یہ لوگ بہت زیادہ آدمیوں کی مجالست سے متنفر اور انسانی جذبات کے فنا کر دینے والے نظر آتے ہیں۔ چونکہ اس حیثیت سے شیخ کی تقریر بالکل ناقص ہے۔ اس لئے اب ہم شیخ کو چھوڑ کر دوسرے علماء کے اقوال کا مختصر انتخاب درج ذیل کرتے ہیں:۔

قاضی ابن رشد اندلسی جس نے امام غزالی کی کتابوں کا رد لکھا ہے اور جس کو اہل یورپ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی خیال کرتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتا ہے کہ خدائے برحق نے اپنی سچی کتاب میں ہم کو جابجا قیاس اور استدلال کے طریقہ پر توجہ دلائی ہے۔ اور ہر چیز کو عقل سے دریافت کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے۔

واذا كانت هذه الشرائع حقاً وداعية الى النظر المؤدى الى معرفة الحق فانا معشرا

اور جب یہ شریعت سچی ہے اور لوگوں کو اس غور و فکر کی طرف بلا رہی ہے۔ جس سے خدا کی معرفت حاصل ہو تو ہم

المسلمین نعلم علی القطع انہ لا یؤدی النظر البرھانی الی مخالفۃ ما ورد بہ الشرع فان الحق لا یضاد الحق۔[1]	مسلمانوں کا قطعی یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ دلیل اور برہان سے شریعت کے خلاف کبھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ اکیونکہ شریعت بھی سچی ہے اور دلیل بھی سچی) اور ایک سچی بات دوسری سچی بات کے مخالف نہیں ہو سکتی

دوسرے موقعہ پر صوفیوں کے روحانی طریقہ کا ذکر کر کے لکھا ہے۔

ونحن نقول ان ھذہ الطریقۃ ان سلمنا وجودھا فانھا لیست عامۃ للناس بما ھم ناس ولو کانت ھذہ الطریقۃ ھی المقصودۃ بالناس لبطلت طریقۃ النظر ولکان وجودھا بالناس عبثاً والقرآن کلہ انما دعا الی النظر والاعتبار وتنبیھا علی طرق النظر[2]	ہم کہتے ہیں کہ اس طریقہ کے وجود سے اگرچہ ہمکو انکار نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ لوگوں میں عام نہیں ہو سکتا۔ پس اگر اسی طریقہ کا رواج پانا شریعت کا مقصود ہوتا۔ تو فکر اور استدلال کا وجود بالکل باطل اور عبث قرار پاتا حالانکہ سارا قرآن قیاس اور استدلال کی طرف بلا رہا ہے اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کر رہا ہے۔

اس کے مقابلہ پر علامہ ابن تیمیہ رسالہ الفرقان میں لکھتے ہیں۔

فمن جرب مایقولونہ ای الانبیاء وما یقولہ غیرھم وجد الصواب معھم والخطاء مع مخالفھم کما قال الرازی مع انہ من اعظم	تو جو شخص انبیاء علیہم السلام کے ارشادات اور لوگوں کے اقوال کا تجربہ کریگا۔ وہ یقیناً انبیاء کو حق پر اور ان کے مخالفوں کو خطا پر پائے گا۔ دیکھو رازی جو سب سے زیادہ عقلی روایات کو غیر متنہم

[1] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر صفحہ ۶ [2] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲

الناس طعناً فی الادلۃ السمعیۃ
حتی ابتدعوا قولاً ماعرف بہ
قائل مشہور غیرہ وھو انھا
تفید الیقین ومع ھذا فانہ
یقول لقد تاملت الطرق الکلامیۃ
والمناھج الفلسفیۃ فما رأیتھا
تشفی علیلا وتروی غلیلا ووجدت
اقرب الطرق طریقۃ القرآن
اقرأ فی الاثبات "الیہ یصعد الکلم
الطیب الرحمن علی العرش
استوی" واقرأ فی النفی "لیس
کمثلہ شی ولا یحیطون بہ علماً"
ومن جرب مثل تجربتی عرف
مثل معرفتی وایضاً فمن تدبر
ماعند الطوائف الذین لا
یعتصمون بتعلیم الانبیاء وارشاد
ھم واخبارھم وجدھم کلھم

ٹھہرانے والے ہیں یہانتک کہ انہوں نے
ایک ایسی بات کہی جو ان سے پہلے کسی نے
بھی نہیں کہی تھی یعنی یہ کہ روایات سے کبھی یقین کا
مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا اُس رازی کو بھی یہ
کہنا پڑا کہ میں نے فلسفہ اور علم کلام کے
طریقوں میں بہت تامل کیا۔ مگر اُن کو
ہرگز ایسا نہ پایا جو ایک مریض کو شفا بخشیں
یا کسی پیاسے کو سیراب کر سکیں۔ ہاں تمام
راستوں میں نزدیک تر راستہ قرآن کا ہے کہ ثبوت
کی جانب میں ہم یہ آیتیں پڑھ لیتے ہیں الیہ یصعد
الکلم الطیب الرحمن علی العرش استوی
اور نفی میں لیس کمثلہ شیئ اور لا یحیطون بہ
علما اور جو کوئی مجھ جیسا تجربہ کریگا وہ بھی میری
طرح اس بات کو سمجھ لیگا اور نیز جو شخص ان لوگوں
کے اقوال میں غور کریگا جنھوں نے انبیاء کی تعلیمات
اور روایات سے استدلال نہیں کیا تو وہ اُن کو حیرو
شک، گمرہی اور جہل مرکب میں مبتلا

حائرین ضالین شاکین مرتابین
اوجاهلین جحدا امر کیا۔[1]

مبتلا پائے گا۔

- ۰۰ -

شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے جن الفاظ سے اپنے خط میں امام فخر الدین رازی کو نصیحت فرمائی ہے وہ اس سے بھی زیادہ صاف اور کھلے ہوئے الفاظ ہیں وہ امام رازی کی حمیت دینے کا شکریہ ادا کرکے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ :-

فاذن ینبغی للعاقل ان یتعرض لنفحات الجود ولا یبقی ماسورًا فی قید نظره وکسبه فانه علی شبهة فی ذلك ولقد اخبرنی من اثق به من اخوانك ممن له فیك نیة حسنة انه رآك وقد بکیت یوما فسالك هو ومن حضره عن بکائك فقلت مسئلة اعتقدتها منذ ثلثین سنة تبین لی الساعة بدلیل لاح

اب عقلمند کے لئے مناسب ہے۔ کہ وہ خدا کی جود وکرم کی خوشبوؤں سے فائدہ اٹھائے اور نظر واستدلال کی قید میں نہ پھنسا رہے۔ کیونکہ وہ اس طرح ہمیشہ مشتبہ حالت میں رہتا ہے۔ چنانچہ مجھ سے تمہارے ایک دوست نے جو مجھ سے ملا اور تمہارے ساتھ حسن عقیدت رکھتا تھا یہ بیان کیا کہ اس نے تم کو ایک روز روتے ہوئے دیکھا۔ جب اس نے اور حاضرین نے رونے کی وجہ دریافت کی تو تم نے یہ جواب دیا کہ ایک مسئلہ جس پر تیس برس سے میں اعتقاد جمائے ہوئے تھا اسی وقت

[1] دیکھو رسائل تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۰۹ -۱۲-

لی ان الامر علی خلاف ما کان
عندی فبکیت لعل الذی لاح
لی ایضاً یکون مثل الاول فهذا
قولك ومن المحال علی الواقف
بمرتبة العقل والفکر ان یستریح
او ان یسکن ولا سیما فی معرفة
الله تعالی فما بالك یا اخی
تبقی فی هذه الورطة ولا
تدخل طریق الریاضات
والمکاشفات والمجاهدات و
الخلوات التی شرعها رسول الله
صلی الله علیه وسلم فتنال ما نال
من قال فیه الله سبحانه عبداً
من عبادنا اتیناه رحمة من
عندنا وعلمناه من لدنا علماه [1]

ایک دلیل سے مجھ کو غلط ثابت ہوا اسکے بعد
مجھ کو کیا اطمینان ہے کہ جو تحقیق مجھ کو اب
ظاہر ہوئی ہو وہ بھی پہلے کیطرح غلط نہ ہو گی
یہ خود تمہارا قول ہے اور واقعی وہ شخص جو
عقل اور استدلال کے مرتبہ سے آگے نہیں
بڑھا نا ممکن ہے کہ سکون اطمینان اور راحت
حاصل کرے - بالخصوص خدا تعالیٰ کی معرفت
میں تو اے برادر پھر بھی تم کیوں اس گرداب
(نظر و فکر) میں پڑے ہوئے ہو - اور
کیوں ریاضات مجاہدات مکاشفات اور
خلوات کا وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے جس
کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع کیا ہے
اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم بھی وہ چیز حاصل کرلو
جو اس بندے نے کی جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا
ہے کہ ہمنے اس کو خاص اپنے پاس سے رحمت اور علم عطا کیا ہے۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو

[1] دیکھو کشکول بہاؤ الدین عاملی مطبوعہ مصر صفحہ ۳۴۲ ۱۲

ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں :-

بلکہ مقصود آنست کہ نسبت بمعتقدات یقینی واطمینانی حاصل کنند کہ ہرگز بہ مشکک زائل نگردد و بایراد شبہہ باطل نشود۔ چہ پائے استدلال چوبین است و مستدل بے تمکین۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب[1]

یعنی مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنے اعتقادات میں ایسے مضبوط ہوں اور ایسا یقین اور اطمینان حاصل کریں جس کو کوئی شک ڈالنے والا زائل نہ کر سکے اور کسی کے شبہات پیدا کرنے سے جاتا نہ رہے کیونکہ استدلال کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں اور مستدل ذراسی پر بھی نہیں ٹھہر سکتا خوب آگاہ ہو جاؤ۔ کہ اللہ کے ذکر سے ہی دل اطمئن ہوتے ہیں۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں :-

" چنانچہ طور عقل ورائے طور حس است کہ آنچہ بحس مدرک نشود عقل ادراک آں می نماید ہمچنیں طور نبوت ورائے طور عقل ست آنچہ بعقل مدرک نشود بنبوت درک می آید وہرکہ ورائے طور عقل طریقہ از برائے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر نبوۃ ست و مصادم بداہت "[2]

اور جیسا کہ عقل کا راستہ حواس کے راستے سے علیحدہ ہے کہ جو چیز حواس سے نہ جانی جائے عقل سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علیحدہ ہے یعنی جس بات کو عقل سے دریافت نہیں کر سکتے اس کو نور نبوت سے جان سکتے ہیں اور جو شخص عقل کے اوپر کوئی اور طریقہ علم کا تسلیم نہیں کرتا وہ درحقیقت نبوۃ کا منکر اور بداہت کا مخالف ہے۔

---

[1] دیکھو مکتوبات مجدد صاحب مطبوعہ دہلی ص ۲۳۳ جلد ۱ [2] دیکھو مکتوبات مجدد صاحب ص ۲۴ جلد ۳

ذرا اور آگے چلکر لکھتے ہیں :-

"و بالجملہ طریق ریاضت و مجاہدات در رنگ طریق نظر و استدلال مفقتے اعتبار پیدا نکند کہ مقرون بتصدیق انبیاء نبود علیہم الصلوات والتسلیمات ۱؎"

اور حاصل یہ ہے کہ ریاضات اور مجاہدات کا طریقہ بھی نظر اور استدلال کے رنگ میں اُسوقت قابل اعتبار اور اعتماد کے ہے جبکہ اسکی تصدیق انبیاء علیہم الصلوات والسلام کے ذریعہ سے ہو چکی ہو۔

علامہ ابن خلدون بھی مجدد صاحب کے پورے پورے ہمزبان ہیں وہ مجدد صاحب سے ذرا زیادہ تشریح کے ساتھ اپنے مقدمہ تاریخ میں تحریر کرتے ہیں۔

"فاتھم ادراکک و مدرکاتک فی الحصر واتبع ما امرک الشارع من اعتقادک و عملک فھو احرص علی سعادتک واعلم بما ینفعک لانہ من طور فوق ادراکک و من نطاق اوسع من نطاق عقلک ولیس ذلک بقادح فی العقل و مدارکہ بل العقل میزان صحیح فاحکامہ

پس تم اپنے علم اور معلومات کو اس حصر کر دینے میں خطاوار سمجھو اکر جو ہم جانتے ہیں تمام موجودات اسی میں منحصر ہیں۔ اور شارع علیہ السلام کے بتلائے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے بہی خواہ اور تمہاری بہبود کو سمجھنے والے ہیں اُنکا علم تمہارے علم کے اوپر اور ایسے ذریعہ سے حاصل ہونیوالا ہے جو تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے باقی ہمارے اس کہنے سے عقل اور اُسکی معلومات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ عقل

۱؎ مکتوبات محمودہ صاحب مطبوعہ دہلی صفحہ ۴۴

يقينية لاكذب فيها - غير انك
لا تطمع ان تزن به امور التوحيد
والاخرة وحقيقة النبوة وحقائق
الصفات الالهية وكل ما وراء
طوره فان ذالك طمع في محال
ومثال ذالك مثال رجل راى
الميزان الذي يوزن به الذهب
فيطمع ان يزن به الجبال -
هذا لا يدل على ان الميزان
في احكامه غير صادق لكن العقل
قد يقف عنده ولا يتعدى
طوره حتى يكون له ان يحيط
بالله وبصفاته فانه ذرة من
ذرات الوجود الحاصل منه و
تفطن في هذا اغلط من يقدم
العقل على السمع في امثال هذه
القضايا وقصور فهمهم واضمحلال

کو ایک میزان صحیح سمجھتے ہیں جسکے احکام یقینی اور
جھوٹ سے پاک ہیں۔ ہاں یہ میزان اتنی بڑی نہیں
ہے کہ تم اس سے توحید و آخرۃ کے امور اور نبوت و
صفات الٰہیہ وغیرہ کے حقائق کو وزن کرنے لگو یہ
تو ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص ایک سونے چاندی
کے تولنے کا کانٹا دیکھے اور اس میں پہاڑوں
کے تولنے کا ارادہ کرنے لگے تو یہ نہ کہا جائیگا
کہ ترازو وزن بتلانیکے اعتبار سے درست
نہیں ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ ہر ایک میزان کیواسطے
ایک حد ہے جسکے آگے وہ کام نہیں دے سکتی
اسی طرح میزان عقل بھی ایک خاص موقع پر ٹھہر جاتی
ہے۔ اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس سے آگے بڑھکر
خدا کی ذات و صفات کا احاطہ کرے کیونکہ خود عقل
بھی وجود کے ان ذرات میں کا ایک ذرہ ہے جو خدا کی طرف
سے فائض ہوتے ہیں اسی جگہ سے تم اُن لوگوں کی
غلطی کم فہمی اور رائے کی کمزوری کو معلوم کرلو جو عقل
کو اس قسم کے معاملات میں سمعیات پر ترجیح دیتے

رایہ فقد تبین لک الحق من ذلک[1]

ہیں۔

دوسرے مقام میں لکھتے ہیں:-

"وقد تنبه لذلك عظيمهم ابو علی ابن سینا فقال فی کتاب المبدأ والمعاد ان المعاد الروحانی واحواله مما یتوصل الیه بالبراهین العقلیة والمقاییس لانه علی نسبة طبیعیة محفوظة وذخیرة واحدة فلنا فی البراهین علیه سعة واما المعاد الجسمانی واحواله فلا یمکن ادراکه بالبرهان لانه لیس علی نسبة واحدة وقد بسطته لنا الشریعة الحقة المحمدیة فلینظر فیها ولیرجع فی احواله الیها[2]"

اور رئیس الفلاسفہ بو علی سینا نے بھی اس بات پر متنبہ ہو کر کتاب المبدأ والمعاد میں یہ کہدیا ہے کہ روح کو عذاب ثواب ہونے پر تو ہم دلائل اور قیاسات قایم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ایسا ہونا مضبوط قانون طبیعی اور ایک خاص طریقے کے تحت میں داخل ہے۔ تو اسکے اندر براہین ثابت کرنیکی گنجائش نکل سکتی ہے۔ مگر جسمانی اعادہ اور جزا سزا کا محض استدلال سے جاننا ہرگز ممکن نہیں کیونکہ وہ کسی خاص نسبت اور قاعدے کے نیچے واقع نہیں ہے۔ لیکن شریعت محمدیہ حقہ نے اسکے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کردیئے ہیں جس کا جی چاہے اسکی طرف رجوع کرکے دیکھ لے۔

جو علوم نہ بذریعہ عقل کے بلکہ بذریعہ کشف کے معلوم ہوں اُن کی بابت

---

[1] دیکھو مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر صفحہ ٣٨٧ [2] دیکھو مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ٤٥٧ ١٢

کہتے ہیں:-

"ثم هذا الكشف لا يكون صحيحاً
كاملاً عندهم الا اذا كان ناشيا
عن الاستقامة لان الكشف
قد يحصل لصاحب الجوع
والخلوة وان لم يكن هنالك
استقامة كالسحرة والنصارى
وغيرهم من المرتاضين و
ليس مرادنا الا الكشف الناشى
عن الاستقامة ومثاله ان
المرأة الصقيلة اذا كانت محدبة
او مقعرة وحوذي بها جهة
المرئي فانه يتشكل فيها معوجاً
على غير صورته وان كانت
مسطحة تشكل فيها المرئي صحيحاً۔[1]

پھر یہ کشف بھی صحیح اور کامل اسوقت تک
نہیں ہوتا جب تک کہ استقامت (یعنی
شریعت کے احکام پر پورا پورا عمل نہ ہو)
ورنہ یوں تو بہت سے ریاضت اور خلوت سے
صفائی قلب حاصل کرنے والوں کو بھی
کشف ہونے لگتا ہے۔ جیساکہ ساحرین
نصاریٰ اور ریاضت کرنیوالے اور ان
دونوں کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک صاف
آئینہ تو محدب اور مقعر (اونچا نیچا)
ہو اس میں کسی چیز کا عکس بھی ٹیڑھا
ترچھا پڑتا ہے۔ اور ایک آئینہ مسطح
(ہموار) ہو۔ اس میں شکل بھی
سیدھی اور صحیح صحیح دکھائی دے
گی۔

حضرت شیخ شہاب الدین صاحب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ تحریر
فرماتے ہیں۔ کہ:-

[1] دیکھو مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۳۹۲

"عقل اور استدلال کے طریقہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ ایسا یقینی نہیں ہوتا جس کا ازالہ نہ ہو سکے" تو گویا اس میں ایک قسم کا تردد اور اضطراب رہتا ہے۔ اور صوفیائے کرام کے علوم بالکل قطعی اور یقینی ہوتے ہیں یعنی ناپائدار نہیں ہوتے ان میں اگر کوئی شک و شبہ پیدا کرنا چاہے۔ تو ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو ایسا ہے کہ گویا اپنی آنکھوں سے ایک چیز دیکھ لی اور اپنے کانوں سے کوئی بات سن لی۔ چنانچہ عوارف میں لکھتے ہیں:۔

فما اضطراب الطبائع الا ضرب من الجهل فقلوب الصوفية واعية لانهم زهدوا فی الدنيا بعد ان احکموا اساس التقوىٰ فبالتقوى زکت نفوسهم و بالزهد صفت قلوبهم فلما عدموا شواغل الدنيا بتحقيق الزهد انفتحت مسام بواطنهم و سمعت آذان قلوبهم[1]

تو یہ اضطراب اور تردد جو طبیعتوں میں دیکھتے ہو یہ بھی جہل کی ایک قسم ہے اس اعتبار سے صوفیوں کے قلوب بہت محفوظ ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے تقویٰ اور طہارت کی بنیاد کو مضبوط کر کے زہد اور ترک دنیا اختیار کیا تو تقویٰ کی وجہ سے ان کے نفس پاک اور زہد کی وجہ سے دل صاف ہو گئے اور جب دنیوی مشاغل کو انہوں نے فنا کر دیا تو ان کے باطن کے مسامات کھل گئے اور ان کے دل کے کان سننے لگے۔

[1] دیکھو عوارف المعارف مطبوعہ مصر صفحہ ۶

متکلمین کی جماعت میں علامہ علاؤالدین علی الطوسی (المتوفی ۸۸۷ھ) نے سلطان محمد فاتح کے حکم سے جو کتاب حکماء کے رد میں لکھی ہے اس کے مقدمہ میں یہ بتلایا ہے۔ کہ ہماری عقل بہت سی اشیاء کی حقیقت دریافت کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ بلکہ بڑے بڑے حکماء محسوسات کی ماہیت معلوم کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں تو ہم کو چند ایسے امور کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے۔ جنکی باریکیوں کو اگرچہ ہم نے خود نہیں سمجھا مگر خدا کے ایسے سچے رسولوں نے ہمکو اُن کی خبر دی ہے۔ جن کی صداقت پر سینکڑوں آیات بینات گواہی دے رہی ہیں۔

کیا ہماری آنکھوں نے اُن تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہے جن کو وہ دیکھ سکتی ہیں، یا ہمارے کانوں نے اُن تمام آوازوں کو سُن لیا ہے۔ جن کو وہ سُن سکتے ہیں، یا ہمارے ہاتھوں نے تمام اُن چیزوں کو چھُو لیا ہے جن کو وہ چھو سکتے ہیں، یا ہماری زبان نے تمام اُن الفاظ کو ادا کر دیا ہے جن کو ہم ادا کر سکتے ہیں، پھر جب ہمارے ان حواس اور ان قوتوں نے اپنے مقدورات پر پورا پورا احاطہ نہیں کیا تو کیا وجہ ہے کہ ہماری عقلی قوت کو اپنی ساری معلومات پر کامل تصرف اور قبضہ حاصل ہو جائے یہاں تک کہ خدا کی ذات وصفات کے مسائل بھی اس کے قابو میں آجائیں اور حقائق اشیا میں سے کوئی حقیقت ایسی نہ رہے جو اسکی دسترس سے

اچھوتی ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پانی آگ مٹی وغیرہ وہ اجسام جو ہر وقت ہم کو نظر آتے ہیں ان کی حقیقت کے دریافت کرنے میں بڑے بڑے فلاسفر متحیر ہیں۔ افلاطون کہتا ہے کہ یہ بسیط اجسام ہیں اور ارسطو کی جماعت کہتی ہے کہ نہیں ہیولی اور صورت سے مرکب ہیں۔ ویمقراطیس کہتا ہے کہ یہ اجسام ایسے ذرات سے مرکب ہیں۔ جو نہایت چھوٹے اور نہایت سخت ہونے کی وجہ سے قابل تقسیم نہیں ہیں۔ پھر اجزاء جسم کے متناہی اور غیر متناہی ہونے کی حیثیت سے نظام کچھ کہتا ہے۔ اور متکلمین کچھ، اسی طرح عقل اور نفس ناطقہ کے بارے میں ہر ایک کا مذہب جداگانہ ہے۔ اور ایک جو دلیل قائم کرتا ہے۔ دوسرا اُس کو رد کر دیتا ہے بھلا وہ نفس جو ہر وقت ہمارے پاس رہتا ہے اور وہ اجسام جو شب و روز ہمارے استعمال میں آتے ہیں۔ جب ان کی حقیقت کے معلوم کرنے میں اذکیاء کا یہ حال ہے تو غیب کے اسرار اور ملکوت کے دقائق تک ان کی رسائی کی کیونکر امید ہو سکتی ہے۔ سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال کی صحیح کیفیت کو وہ ہی شخص سمجھے جس کی تائید خدا کی جانب سے کی گئی ہو۔ یا ایسا شخص اس کی اطلاع کرے۔ جس کے مبعوث من اللہ ہونے پر ہزاروں علامات ظاہر ہو چکی ہوں۔ ورنہ جو

احمق نبوت کے انوار سے مستفید ہوئے بغیر محض اپنی عقل پر بھروسہ کر کے الٰہیات کی کُنہ تک پہنچنا چاہے گا۔ اس کے اوہام یقیناً اس کی عقل سے سخت مزاحمت کرینگے۔ اور اُس کو وہمی اور عقلی چیزوں کے تمیز دینے میں ایسی دشواری پیش آئے گی۔ جس کے انسداد کی کوئی تدبیر اس کے پاس نہ ہوگی۔ ارسطو کا یہ قول نہایت انصاف پر مبنی ہے کہ الٰہیات کے مسائل میں دلائل سے یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

باقی جن حکماء نے انبیاء کی تقلید کو چھوڑ کر ان مسائل میں انہماک پیدا کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خدا تعالیٰ نے ان کو فطرتاً ذہین بنایا تھا اور اُن کی عقلوں میں ایک قسم کی تیزی پیدا کی تھی۔ جس کے ذریعہ سے انہوں نے ہندسہ اور حساب وغیرہ علوم میں ایسی کامل دستگاہ پیدا کر لی کہ اس اعتبار سے اُن کی جس قدر تعظیم کی جاتی تھوڑی تھی۔ لیکن افسوس انہوں نے خدا کے اس انعام کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اور وہ اس کے پورے پورے مصداق بن گئے ؏

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

انہوں نے ایسے لق و دق میدان میں قدم رکھنے کی جراءت کی کہ جو اُن کی فہم و فراست کی سرحد سے بالکل خارج تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود بے راہ ہوئے اور اوروں کو گمراہ کیا۔

اب اُن کے اس حال سے ہر ایک انسان کو چاہیئے کہ عبرت حاصل کرے اور کسی ایسے رسول کے اقوال پر جس کی راستبازی دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہو لے چون وچرا اعتماد کر کے اپنے دل کو ان اضطرابات اور شکوک واوہام سے رستگاری دے وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[ا]

اب یہاں پہنچکر ہم کو چاہیئے تھا - کہ ہم قلم کی باگ امام غزالی کی تقریر کی طرف پھیر دیتے جس کا حوالہ ہم بہت دور سے دیتے چلے آرہے ہیں کیونکہ اس وقت ہم حکما اور متکلمین صوفیہ اور مورضین سب کے کلاموں کے انتخاب سے فارغ ہو چکے ہیں - اور ہماری تحریر کے پڑھنے والوں میں جو تحریک اس مسئلہ کی بابت ہم پیدا کرنا چاہتے تھے - وہ بھی غالباً پیدا ہو چکی ہے - لیکن بڑی کوتاہی ہو گی اگر ہم اس موقع پہ شاہ ولی اللہ صاحب جیسے یگانہ عصر کو فراموش کر جائیں جن کی نسبت مشہور ہے کہ متاخرین میں ان سے بڑھکر کوئی اس مسئلہ (عقل ونقل) کا سمجھنے والا پیدا نہیں ہوا اور نہ اس اخیر دور میں اُن سے زیادہ کسی نے شریعت کے اسرار اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کئے وہ اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

[ا] - یہ سب تفصیل کتاب الذخیرہ مطبوعہ دائرۃ المعارف صفحہ ۱۰۹ میں مذکور ہے

قد يظن ان الاحكام الشرعية
غير متضمنة لشيء من المصالح
وانه ليس بين الاعمال وبين
ما جعل الله جزاءً لها مناسبة
وان مثل التكليف بالشرائع
كمثل سيد اراد ان يختبر طاعة
عبده فامره برفع حجر او لمس
شجر مما لا فائدة فيه غير
الاختبار فلما اطاع او عصى
جوزي بعمله وهذا ظن فاسد
تكذبه السنة واجماع القرون
المشهود لها بالخير[1]۔

کبھی یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ شریعت کے
احکام عقلی مصالح پر مشتمل نہیں ہیں اور نہ اعمال
میں اور ان کی پاداش میں کوئی خاص مناسبت
ملحوظ ہے اور یہ کہ انسان کو خدا کی جانب سے
احکام شرعیہ کا مکلف بنانا ایسا ہے۔ جیسا
کوئی آقا اپنے غلام کی فرمانبرداری کا امتحان
کرنا چاہے اور اس کو کسی پتھر کے اٹھالانے یا
کسی درخت کے چھونے یا کسی اور ایسے کام کا
حکم کرے جس میں اس کی آزمائش کے سوا کوئی
فائدہ نہ ہو اب اگر اس غلام نے اطاعت کی
یا نہ کی تو اسکو ویسا ہی بدلہ دیدیا گیا۔ شریعت کی
بابت یہ خیال بالکل فاسد ہے جس کی تکذیب سنت اللہ اور [illegible]

پھر ایک ورق کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں۔

نعم كما اوجبت السنة هذا
وانعقد عليه الاجماع فقد
اوجبت ايضا ان نزول القضاء

ہاں جیسا کہ سنت اور اجماع سے یہ ثابت ہے
اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ خدا کی طرف محض
کسی چیز کے وجوب یا حرمت وغیرہ کے متعلق

[1] دیکھو حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر صفحہ ٥ ۱۲

بالایجاب والتحریم سبب عظیم
فی نفسہ مع قطع النظر عن
تلك المصالح اثابۃ المطیع
وعقاب العاصی وانہ
لیس الامر علی ماظن من
ان حسن الاعمال وقبحھا بمعنی
استحقاق العامل الثواب و
العذاب عقلیان من کل وجہ
وان الشرع وظیفتہ الاخبار
عن خواص الاعمال علی ماھی
علیہ دون انشاء الایجاب
والتحریم بمنزلۃ طبیب یصف
خواص الادویۃ وانواع المرض
فانہ ظن فاسد تجد السنۃ
بادی الرای ۱؎

حکم کا نازل ہونا بھی مصالح عقلیہ سے قطع نظر
کر کے نیکوں کو ثواب اور گنہگاروں کو عذاب
دینے کا بڑا سبب ہے اور ایسا نہیں جیسا کہ بعضوں
کا گمان ہے کہ اعمال کا حسن و قبح یعنی ان کے کرنے
نہ کرنے پر عذاب و ثواب کا استحقاق محض
عقل سے ثابت ہو سکتا ہو۔ باقی شریعت کا کام اس
طبیب کی طرح جو دواؤں کے خواص اور
مرض کے اقسام کو بیان کرتا ہے صرف
یہ ہو کہ وہ اعمال کی واقعی خاصیتوں کو
ظاہر کر دے نہ یہ کہ وہ اپنی طرف سے
کسی چیز کو واجب یا حرام بتائے
اس قسم کے خیالات بالکل فاسد
ہیں۔ جن سے کھلے طور پر سُنت
رسول اللہ نفرت کرتی ہے

؎

یہ تمام اقوال جو یہاں تک نقل کئے گئے اُن مستند علماء کے اقوال

۱؎ - دیکھو حجۃ اللہ البالغۃ مطبوعہ مصر صہ ۶ ۱۲

ہیں۔ جو بلحاظ اپنے فضل و کمال کے امت محمدیہ کے آفتاب اور ماہتاب شمار کئے گئے ہیں۔ اور جن کی فضیلت خواہ کسی حیثیت سے ہو چار دانگ عالم میں تسلیم کی جا چکی ہے۔

لیکن ان متفرق اقوال اور پراگندہ مضامین سے ایک کم علم آدمی بجائے اس کے کہ کچھ فائدہ اٹھائے۔ سخت پریشانی میں پڑ جاتا ہے۔ اور وہ متعین نہیں کر سکتا۔ کہ میں ان میں سے کس بات کو لوں اور کس کو چھوڑوں اسی تذبذب کے وقت میں امام غزالی آتے ہیں اور احیاء العلوم وغیرہ کے ذریعہ سے اُس کی دستگیری کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ گھبراؤ نہیں یہ سب باتیں درست ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے اگر کسی مذہب حق کے تمام احکام عقل کے مطابق ہیں، اور یہ بھی ایک اعتبار سے صحیح ہے اکہ نبوۃ اور ولایت کا مرتبہ عقل سے بالاتر ہے یہ بھی غلط نہیں کہ ہر ایک علم عقل ہی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے، اور اس کہنے میں بھی حرج نہیں اکہ بعض علوم عقل کے سوا اور کسی طریقے سے بھی حاصل ہو جاتے ہیں، اُس کو بھی ہم تسلیم کرتے ہیں، کہ شریعت کے تمام احکام عقلی مصالح پر مبنی ہیں، اور یہ کہنا بھی بیجا نہیں، کہ محض عقلی مصالح کسی چیز کے فرض کرنے یا حرام کرنے کے لئے کافی نہیں،

ممکن ہے کہ تمہاری کمزور طبیعت ان متضاد بیانات کو دیکھکر

گھبرا اُٹھے۔ اور تم ان پیدا ر مقدمات کو کوئی منطقی طلسم سمجھنے لگو۔ مگر جو جامع مانع تقریر ہم عنقریب درج کریں گے اس کو پڑھکر تمہاری تسلی ہو جائے گی۔ اور تم یقین کر لو گے کہ ان اقوال میں لفظی نزاع کے سوا، کوئی حقیقی اختلاف سمجھنا ہمارے فہم کی تقصیر ہے۔

تم سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ انسان کو قدرت نے دوسرے حیوانات سے کون سی امتیازی حالت عطا کی ہے۔ کیا قدرت، ارادہ، خوف، رجا، شہوت۔ غضب یہ صفات جو انسان میں رکھی ہوئی ہیں، اور حیوانات میں نہیں ہیں۔ یا آنکھ، ناک، کان، زبان، دست، و پا جو اعضا انسان کو عنایت کئے گئے ہیں اوروں کو نہیں دیئے گئے۔ یا حس مشترک خیال، وہم، حافظہ وغیرہ حواس باطنہ جو انسان میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ دوسروں کے حصہ میں نہیں آئے۔ تم یقیناً کہو گے کہ ان سب چیزوں کے اعتبار سے انسان کو کوئی فضیلت اور جانوروں پر حاصل نہیں ہے۔ بلکہ بسا اوقات بعض جانور ان بعض قوتوں میں انسان سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تو پھر وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان کی شرافت جانوروں کے مقابلہ میں تسلیم کر لی گئی۔ اور وہ کیا علامات ہیں جو انسان کے روشن چہرہ کے امتیازی خط و خال ہیں؟

اس کے جواب میں ہم بجز اُن دو چیزوں کے کسی کا نام نہیں لے سکتے - جن کا اختصار علم اور ارادہ کے دو چھوٹے چھوٹے لفظ کرتے ہیں - اور جن کی تشریح میں ہم کو اپنے ناظرین کے وقت کا ایک معتدبہ حصہ لینا پڑیگا : علم سے ہماری مراد وہ علم ہے - کہ جس کی بدولت دنیا اور آخرت کے حالات منکشف ہوتے ہوں - اور وہ کائنات کے حقائق کو اُن کی اصلی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو - اور ارادہ کے لفظ سے ہم نے اس ارادہ کا قصد کیا ہے - جو نفسانی خواہش کے اشارہ پہ نہیں ، بلکہ علم کے اشارہ پہ چلنے والا ہے - کیونکہ جو ارادہ قوت شہوانی کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے وہ تو تمام حیوانات میں موجود ہے - ہر جاندار بھوک اور پیاس کے وقت دانہ پانی کی طلب میں دوڑتا ہے - شہوت کے غلبہ کیوقت اُس کے فرو کرنے کا ارادہ کرتا ہے - اور اپنے دشمن کے مقابلہ میں پوری طاقت اور زور آزمائی دکھلاتا ہے - تو کیا ان سب حالتوں میں ارادہ نہیں پایا گیا - لیکن ہاں وہ ارادہ نہیں جو افراد انسانی کی خصوصیات میں سے ہے - انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شہوانی میلان کے خلاف بھی اگر اسکی عقل ہدایت کرے حرکت کر سکتا ہو - اور اپنے فعل و ترک میں جی چاہنے نہ چاہنے کا پابند نہ ہو -

یہ ارادہ اور وہ علم جس کا ذکر پہلے ہوا برگزیدہ ترین مخلوقات یعنی انسان کیساتھ مختص ہیں۔ اور ان ہی دو نشانیوں سے انسان حیوانات سے اور بڑا آدمی بچوں سے باعتبار اپنے کمال کے پہچانا جاتا ہے۔ بچہ جب اپنی پیدائش کے مدارج طے کرتا ہوا رحم مادر سے باہر آتا ہے۔ تو وہ نہ بھلے برے۔ نیک بد اور نافع مضر کی تمیز رکھتا ہے اور نہ اس کا کوئی ارادہ کسی قانون عقلی کا تابع ہوتا ہے۔ اور جوں جوں اس کے قویٰ میں نشو ونما، اس کے علم میں ترقی، اس کی معلومات میں وسعت ہوتی جاتی ہے۔ اسی قدر اس کے افعال و اعمال فہم و دانش کے قاعدوں میں منضبط ہوتے جاتے ہیں۔ اب اگر اس کا علم سچا ہے اور اس کی عقل نے جو فتوے نافذ کئے ہیں۔ وہ صحیح ہیں۔ تو اس کے سب عمل درست ہو سکتے ہیں۔ اور اگر اس کی عقل نے لغزش کھائی۔ نافع کو مضر، مضر کو نافع، یا نیک کو بد، بد کو نیک سمجھ لیا۔ تو ہرگز توقع نہیں کہ وہ اپنی حرکات و سکنات میں کج روی و غلطی سے محفوظ رہے۔ اس صورت میں ہر انسان پر واجب ہے، کہ وہ صحیح علم کے حاصل ہونے کے ذرائع سوچے اور تا زیست اپنے اندر ان کے پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن جس حد تک غور کیا گیا۔ علم کی حقیقت اس سے زیادہ

معلوم نہیں ہوتی کہ کسی چیز کا نقشہ ایسی طرح ہماری عقل میں کھینچ جائے جیسا کہ آئینے میں کسی شے کی تصویر نظر آنے لگتی ہے دیکھو اگر کوئی شخص ہماری نظر سے گذرا یا ایک شاندار مکان ہم نے کسی جگہ دیکھا اور کچھ دیر کے بعد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ تو پھر ہم جب کبھی اس شخص یا اس مکان کو دیکھتے ہیں۔ فوراً شناخت کر لیتے ہیں۔ کہ یہ وہی شخص اور وہی مکان ہے اگر ہمارے پاس کوئی ایسا نقشہ جو اس مکان یا اس شخص پہ پورا پورا منطبق ہو موجود نہ ہوتا۔ تو وہ اور کونسا معیار تھا جس کے ذریعہ سے اتنی مدت کے بعد ہم کو یہ شناخت ہوگئی۔ اس سے صاف طور پہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کا ذہن (عقل) مثل ایک آئینہ کے ہے۔ اور اس میں جو معلومات حاصل ہوتے ہیں وہ اُس عکس کی مانند ہیں۔ جو کسی شے کے محاذات کے وقت آئینہ میں دکھائی دیتا ہے۔ اتنا فرق ہے۔ کہ آئینہ میں صرف اُن اشیاء کا عکس پڑتا ہے۔ جو آنکھوں سے نظر آنے کے قابل ہوں۔ اور ذہن میں ہر قسم کی چیزیں منتقش ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کسی اسپیکر کی ایک لمبی چوڑی تقریر تم نے سُنی۔ اور اُس کے مضامین کا خلاصہ تم نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھا۔ تو اب جب کبھی کوئی شخص وہ تقریر کریگا۔ تم فوراً سمجھ جاؤ گے کہ یہ بعینہٖ وہ مضامین ہیں۔ جو فلاں اسپیکر

نے بیان کئے تھے۔ اگر اُن مضامین کا کوئی فوٹو تمہارے پاس نہیں تھا تو تم نے یہ کیسے جانا کہ وہ اور یہ تقریر ایک ہی ہیں۔ اس سے بدیہی طور پر معلوم ہوا کہ ہمارے ذہن میں ان مضامین کا کوئی خاکہ موجود تھا۔ حالانکہ ان ہی مضامین کا عکس اگر ہم آئینہ میں لینا چاہیں۔ تو بالکل ناممکن ہے۔

غرض آئینہ میں اور ذہن میں اتنا تفاوت ہے۔ کہ ایک میں مخصوص چیزوں کا عکس آتا ہے۔ اور دوسرے میں ہر چیز کا مگر دونوں میں اس قدر اشتراک ہے کہ اس میں بھی کسی چیز کی تصویر حاصل ہوتی ہے اور اس میں بھی اب اگر کوئی چیز آئینہ میں منعکس ہونے کے قابل ہو لیکن منعکس نہ ہو۔ تو جہاں تک تتبع اور استقراء سے معلوم ہوا اس کے پانچ وجوہات ہو سکتے ہیں۔ یا یہ کہ وہ جوہر (لوہا) جس سے آئینہ بنتا ہے۔ اس نے ابھی تک صیقل ہو کر آئینہ کی صورت اختیار نہیں کی۔ یا آئینہ بن چکا۔ مگر زنگ آلود ہو گیا۔ یا صاف و شفاف ہے مگر جس چیز کا عکس اس میں لینا چاہتے ہو وہ اُس کے مقابل نہیں۔ یا مقابل بھی ہے۔ مگر آئینہ کے اور اُس شے کے بیچ میں کوئی دوسری شئے حائل ہے۔ یا عکس لینے والے کو یہ معلوم نہیں کہ اس صورت کا عکس کس جہت میں ہو کر لیا جا سکتا ہے۔ ان سب حالتوں میں

اشیاءِ مطلوبہ کا عکس آئینہ میں نہیں آسکتا اور اگر ان موانع میں سے کوئی مانع موجود نہ ہو تو پھر محال ہے کہ محسوسات کی صورت اس میں ظاہر نہ ہو۔

ٹھیک اسی طرح انسان کے قلب (عقل) کی حالت ہے۔ کبھی تو ایسا ہوگا کہ خود قلب ابھی ناقص ہے اور انعکاس کی پوری قابلیت اس میں پیدا نہیں ہوئی۔ جیسا کہ شیر خوار بچہ کا قلب کہ وہ معقولات کے علم سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ اور کبھی معاصی اور ناپاک افعال کے ارتکاب سے قلب پہ ایک قسم کی کدورت اور ظلمت چھا جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی پوری جلا اور صفائی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے اس میں لطیف اور باریک چیزوں کا انعکاس نہیں ہوتا۔ اور خدا کی ذات و صفات اور غیب کے اسرار سے یہ قلب بالکل عاری رہتا ہے۔ اس قلب کے زنگ چھوڑانے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وہ ہمہ تن خدا کی اطاعت کی طرف توجہ اور مقتضائے شہوات سے پورا پورا اعراض کرے اور مجاہدات کا وہ طریقہ اختیار کرے جو اس فن کے تجربہ کاروں نے ناجائز خواہشات کے استیصال کے واسطے تلقین کیا ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (پ ۲۱ - ع ۲) اور من عمل بما علم ورثہ اللہ علم ما لم یعلم میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن کبھی آدمی کا قلب گناہوں کی آلائشوں سے پاک و صاف ہوتا ہے۔ اور پھر بھی اس میں علوم ذات وصفات اور حقائق اشیاء مرتسم نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کی توجہ ان چیزوں کی طرف کامل نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ آفات نفس کے جاننے یا طریق معاش کے مہیا کرنے میں مثلاً مصروف ہوتا ہے۔ تو وہ چیزیں جن کی طرف اسکے قلب کو توجہ نہیں ہے۔ اسی طرح منعکس نہیں ہو سکتیں۔ جس طرح آئینہ میں وہ صورتیں جو اس کے محاذی نہ ہوں۔ ہاں قلب کبھی صاف بھی ہوتا ہے۔ اور توجہ بھی کامل ہے۔ مگر وہ فاسد عقاید جو تقلید یا حسن ظن کی بنا پر دل میں پہلے سے راسخ ہیں۔ حقائق کے انعکاس کیلئے حجاب بن جاتے ہیں اور جیسا کہ اور شے مطلوب کے درمیان میں اگر کوئی شے حائل ہو جائے تو اس کا عکس اس میں نہیں پڑتا۔ ایسے ہی حجاب کے وقت ہماری عقل حقیقی علوم کے حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اور کبھی علم کے یہ تمام سامان جمع ہوتے ہیں۔ مگر جن حاصل شدہ علوم پر یہ علم متفرع ہوتا ہے۔ ان میں مناسبت ترتیب قائم کرنی ہم کو نہیں آتی۔ اس لئے ہم علم سے محروم رہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ ایک شخص اپنی گدی کے پیچھے کا حال آئینہ میں دیکھنا چاہے۔ اب اگر وہ آئینہ کو آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے۔ تو پیچھے کا حال اس میں کھل نہیں سکتا اور اگر پیچھے

لیجاتا ہے۔ تو گو انعکاس ہو جاتا ہے۔ مگر آنکھیں اس عکس کو دیکھ نہیں سکتیں ،،

اس وقت یہ شخص باوجود تمام اسباب مہیا ہونے کے عکس کے دیکھنے سے اس لئے محروم ہے۔ کہ اس کو اس عکس کے لینے کا طریقہ معلوم نہیں۔ اگر کوئی اس کو یہ بتلا دے کہ ایک آئینہ پیچھے لیجاؤ اور ایک آئینہ اسکے محاذات میں اس طرح سامنے رکھو کہ جو عکس اُس آئینہ میں پڑے اُسی عکس کا پرتو دوسرے آئینہ میں بھی آجائے تو اس طریقہ کے معلوم ہونے سے اس کی ساری مشکل حل ہو جائے گی۔ اور جو دقتیں اس عکس کے لینے میں وہ اٹھا رہا تھا وہ یک لخت جاتی رہیں گی۔

یہی حال بعینہٖ انسان کے قلب کا سمجھو۔ اور یقین کر لو کہ یہی امور ہیں۔ جو اکثر حقائق کی معرفت سے ہم کو بے بہرہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ موانع نہ ہوں تو بیشک ہر قلب اس فیض علم کے حاصل کر لینے کی پوری قابلیت رکھتا ہے۔ جو فیاض ازل کی طرف سے بغیر کسی بخل کے ہر وقت اور ہر آن جاری ہے۔

تو جو لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ سچے مذہب کے احکام عقل کے مطابق ہوتے ہیں۔ اُن کا یہ قول اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ کہ ایک کامل اور صاف و شفاف عقل جس میں حقائق کے انعکاس کی سب شرائط موجود ہوں ہرگز

خدا کے حکم کے خلاف حکم نافذ نہیں کر سکتی - اور جنہوں نے یہ کہا ہے - کہ احکام خداوندی کو اپنی عقل کی میزان میں نہ تولو اُن کی غرض یہ ہے - کہ ہماری زنگ آلود عقلوں میں خدائی اسرار کا انعکاس نہیں ہو سکتا - اسی طرح جس فریق کا یہ خیال ہے کہ حقائق نبوت اور حقائق صفات الٰہیہ ہماری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں - وہ عام فہم اور ادراک کے لحاظ سے بالکل سچ کہتے ہیں اور جس شخص کا یہ قول ہے کہ نہیں یہ چیزیں بھی بذریعہ عقل انسانی کے دریافت ہو سکتی ہیں - تو اس کا مدعی بھی غلط نہیں ہے - وہ بجا طور پر عقل انسانی اسی کو قرار دیتا ہے - جس میں نفسانی کدورتیں اور آلائشیں نہ ہوں -

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ لوگ درجات عقل کے موافق جنت میں جائیں گے - اس پر محمول ہے - کہ حقیقی عقل کو جس قدر ترقی ہو گی جنت کے دروازوں سے قرب ہوتا جائے گا - اور یہ مقولہ کہ اکثر اہل جنت بے عقل ہوں گے - اس میں وہ لوگ مراد ہیں - جو دُنیا کے کاموں میں متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے ابلہ سمجھے جاتے ہیں - اور علیکم بدین العجائز کا خطاب بھی انہیں سے ہے - جن کے دماغ دقیق اسرار کے متحمل نہیں ہو سکتے -

اب تم ایک دفعہ اُن متعارض اقوال کو یاد کر لو - جن کے سلجھانے میں تم سخت پریشان تھے - اور جن کی کوئی درست توجیہ تم سے بن نہ پڑتی تھی - اور اخیر میں امام صاحب کی اس زرّیں نصیحت کو خوب یاد رکھو کہ :-

فلا غنا بالعقل عن السماع ولا
غنا بالسماع عن العقل فالداعی
الی محض التقلید مع عزل العقل
بالکلیۃ جاهل والمکتفی بمجرد
العقل عن انوار القران والسنۃ
مغرور فایاک ان تکون من
الفریقین وکن جامعا بین
الاصلین فان العلوم العقلیۃ
کالاغذیۃ والعلوم الشرعیۃ
کالادویۃ والشخص المریض
یستضر بالغذاء متی فاتہ
الدواء فکذلک امراض القلوب
لا یمکن علاجها الا بالادویۃ
المستفادۃ من الشریعۃ وهی
وظائف العبادات والاعمال
التی رکبها الانبیاء صلوات
اللہ علیهم لاصلاح القلوب

نہ عقل کو نقل سے استغنا اور نہ عقل نقل
سے بے نیاز ہے ۔ جیسا کہ عقل کو معزول کرکے
محض تقلید کی طرف بلانے والا جاہل ہے
اسی طرح وہ شخص بھی دھوکہ میں ہے جو قرآن
وسنت کے انوار سے علیحدہ ہو کر صرف اپنی
عقل پر بھروسہ کرے تو تمکو ان دونوں گروہوں
میں سے کسی میں بھی داخل نہ ہونا چاہیئے ۔ بلکہ
عقل ونقل کا جامع بننا چاہیئے ۔ کیونکہ علوم
عقلیہ عقل کی غذا اور علوم شرعیہ اس کی دوا
ہیں ۔ اور جو مریض دوا کا استعمال نہ کرے
اُسکو غذا کے استعمال سے نقصان پہنچ جاتا ہے
یہی حالت دل کے امراض کی ہے کہ اُن کا علاج
شرعی دواؤں سے یعنی اُن عبادات اور اعمال سے
ہی ہوسکتا ہے جن کو انبیا علیہم السلام
نے اس کام کے لئے ترکیب دیا
ہے ۔ پس جس کا دل بیمار اور وہ طب
شرعی کے بموجب اس کا معالجہ بھی نہ کرے

فمن لا یداوی قلبه المریض بمعالجات العبادة الشرعیة واکتفی بالعلوم العقلیة استنصر بها کما یستضر المریض بالغذاء وظن من یظن ان العلوم العقلیة مناقضة للعلوم الشرعیة وان الجمع بینها غیر ممکن ظن صادر عن عمی فی عین البصیرة - نعوذ باللہ منہ -

اور علوم عقلیہ کو اپنے حق میں کافی سمجھے وہ اسی طرح ہلاک ہوگا۔ جس طرح بیمار آدمی غذا سے ہلاک ہو جاتا ہے - باقی جو لوگ یہ علوم عقلیہ کو علوم شرعیہ کے خلاف تصور کرتے ہیں - اور دونوں میں تطبیق کو محال سمجھتے ہیں۔ یہ اُن کا خیال اس وجہ سے ہے - کہ ان کی بصیرت کی آنکھیں اندھی ہیں - (خدا کی پناہ)

یہانتک ہم نے امام غزالی کی تقریر کا ماحصل نقل کر دیا - امام صاحب کی تقریر اگرچہ نہایت صاف، نہایت سلیس، نہایت عام فہم اور نہایت پر اسرار ہے - لیکن اس میں چند ایسے اقناعی مقدمات بھی ہیں جن کا انکار کر دینا ہمارے ایک بیباک حریف سے کچھ مستبعد نہیں ہے -

ہم امام صاحب کے اس قابل قدر بیان کی بہت کچھ عزت کر سکتے ہیں لیکن ہمارا ایک ظاہر پرست اور آزاد منش مقابل اس پر یہ نکتہ چینی کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ہم ذہن میں صورتوں کا انعکاس تسلیم کر لیں۔ تو جو شرائط آئینہ میں انعکاس کیواسطے قرار دی گئی ہیں - اُن سب کا

ذہن میں پایا جانا کیوں ضروری ہے۔ یہ ہم نے مانا کہ ذہن میں اور آئینہ میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ مگر ان دونوں میں تفاوت بھی بے انتہا ہے۔ جس کا اعتراف تم بھی پہلے کر چکے ہو۔ اب اگر ان تفاوت کی بنا پر بعض وہ شرطیں جو آئینہ میں ضروری ہیں۔ حصول علم میں ضروری نہ ہوں یا اس کے برعکس، تو کیا مضائقہ ہے۔

اس کے سوا یہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اعمال بد کی مباشرت یا گناہوں کے ارتکاب سے قلب پر کسی قسم کی تاریکی آجاتی ہے۔ اول تو ہم اعمال کی تقسیم نیک و بد کی طرف تسلیم ہی نہیں کرتے دوسرے معاصی میں ملوث ہونا بیشک قوت عملیہ کے سست یا فاسد ہونے کا نتیجہ ہے لیکن قوت علمیہ کا اس اثر بد سے متاثر ہونا بظاہر کوئی معنی نہیں رکھتا نیز بقول قاضی ابن رشد اندلسی کے قرآن پاک نے جابجا قیاس اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کیا ہے۔ اور خود بھی مختلف مواقع میں استدلال سے کام لیا ہے۔ پس اگر شریعت کے احکام عقول عامہ سے بالاتر تھے۔ تو قرآن نے ہم سب کو عقل سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی طرف کیوں توجہ دلائی۔ اور بقول سرسید کے ہر ایک انسان کو ایسے احکام کا مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا۔ جو اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ حالانکہ انسان اپنے ذی عقل ہونے کی وجہ سے ہی تکلیف شرعی کا مستحق ہوا ہے۔

یہ اور اسی قسم کے اور شبہات ہیں جن کو سنکر ہم صرف اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است
سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجا ست

اور بپاس خاطر معترض امام صاحب کے جادہ استدلال سے ہٹ کر یا آگے بڑھکر اُس زبردست فاضل کی تقریر کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی تصنیفات میں جتنا غور کرو اتنا ہی اسکی وہبی دانشمندی اور صادق البیانی کا اعتراف لازم ہے یہ وہ فاضل ہے کہ جس کو اگر ہم اپنے عہد کا شیخ اکبر امام غزالی اور شاہ ولی اللہ سب کچھ کہدیں تو بیجا نہیں۔ اور یہی وہ فاضل ہے جس نے علم کلام کی ایک ایسے انوکھے طرز میں بنا ڈالی جو (انشاء اللہ) قیامت تک کے واسطے پتھر کی لکیر ہے اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

اس فاضل نے جس کو عام طور پر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اپنی مختلف کتابوں میں جو مفید بیانات درج کئے ہیں۔ وہ اس مسئلہ مقل نقل میں ہماری بہت زیادہ مشکل کشائی کرتے ہیں اور اب ہم ذیل میں جو کچھ لکھیں گے۔ وہ تمام تر انہی تصانیف سے ماخوذ ہو گا۔ ؎

مطرب ترانہ دگر از پردہ ساز کن
زیرا کہ حرف عشق نمیدارد انتہا

صحیفۂ عالم کا وسیع مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی روشن ہو چکی ہے

کہ (بقول طبیعیین کے فطرت نے اور بخیال اہل مذاہب کے) خدائے مختار نے دنیا کی کوئی چیز بیکار نہیں بنائی۔ اور جوں جوں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ووں ووں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز کے منافع ہم پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے کائنات کا ہر ہر جزو بیش قیمت حکمتوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شے کا تعلق کسی نہ کسی ایسی ایک یا چند اغراض سے بھی ہوتا ہے۔ جن کی کمی زیادتی پر اُس شے کا کمال اور نقصان منحصر ہے۔ اور جن کو ہم اُس شے کے اصلی اغراض کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً حیوانات میں گھوڑے کی مدح و ذم اور اُس کا حسن و قبح رفتار پر موقوف ہے اگرچہ وہ گدھے کی طرح پالان بھی اٹھا سکتا ہے اور گائے بکری کی طرح اس کو ذبح کر کے کھا بھی سکتے ہیں۔ اور اس کا دودھ بھی پی سکتے ہیں۔ لیکن یہ اسکے دودھ کی افراط یا بدن کی فربہی یا بار برداری کی طاقت اس کی قدر و قیمت میں اسی طرح کچھ زیادہ دخیل نہیں جسطرح گائے اور بھینس میں چونکہ مقصود اعظم دودھ گھی وغیرہ ہے۔ اس لئے اُن کی تیز رفتاری اور قدم بازی کا کوئی اثر ان کی بھلائی برائی پر نہیں پڑتا یا گلاب کے پھول کی حسن و خوبی اس کے رنگ و خوشبو سے ہے۔ ذائقہ سے کچھ بھی غرض نہیں ہوتی یا آنب کے ذائقہ سے سروکار ہے۔ اس کے رنگ اور خوشبو سے چنداں تعرض نہیں کیا جاتا

ایسے ہی کتاب سے اگرچہ ہم کسی وقت تکیہ کا کام لے سکتے ہیں۔ لیکن غرض اصلی اس سے پڑھنا ہی ہوتا ہے۔ یا ضرورت کے وقت کپڑوں کو جلا کر کھانا پکا سکتے ہیں۔ مگر اہم مقصد اُن سے یہی ہے۔ کہ وہ آدمی کے بدن کی پردہ پوشی اور زینت کا سبب بنیں۔

غرض عالم کے تمام اجزا پر نظر ڈالی جائے ہر موقعہ پہ یہی شان نظر آئے گی پھر نا ممکن ہے۔ کہ انسان جو ہمیشہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کیا کرتا ہے۔ کسی ایسی غرض اعلیٰ اور مطلب اعظم سے خالی ہو جس کے ہونے نہ ہونے پر اس کی بھلائی برائی موقوف ہو۔ اور جس کے ذریعہ سے وہ مدح وستائش یا ہجو و مذمت کا مستحق سمجھا جائے۔

بیشک اس مقصد اعظم کے متعین کرنے میں ہم کو سخت دشواری پیش آئے گی۔ لیکن ہم اس عقدہ کو خود اعضائے انسان کی بناوٹ اور اس کے قویٰ کی ترکیب سے حل کریں گے۔ اور ہم یقین کرتے ہیں۔ کہ خود انسان زبان حال سے اس مقصد کی جستجو میں ہماری رہنمائی کرے گا۔

ہم جب اس معجون مرکب (انسان) کی اندرونی و بیرونی حالتوں میں غور کرتے ہیں۔ تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان پانچ چیزوں سے اس کی ترکیب عمل میں آئی ہے۔ عقل یعنی قوۃ علمیہ شوق یا خوف ارادہ اور اختیار۔ قدرت اور طاقت۔ ہاتھ پاؤں آنکھ ناک وغیرہ اعضائے

جسمانی۔ چنانچہ جس قدر کام انسان کرتا ہے ان میں یہ پانچوں آلات اپنا اپنا عمل کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک شخص شب کے وقت ایک جنگل میں چلا جا رہا ہے اس نے دور سے اپنے راستہ پر کسی جانور کو دیکھا۔ جس کی نسبت کبھی تو اس کا خیال ہوتا ہے کہ یہ شیر ہے۔ اور کبھی سمجھتا ہے کہ کوئی بیل کھڑا ہے۔ اب فطرۃً انسان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے نفع اور ضرر کے پہلوؤں کو سوچے۔ اگر اس پر ضرر کا پہلو متعین ہو گیا۔ یعنی یہ کہ پھاڑ کھانے والا شیر ہے تو طبعاً اس پر ایک قسم کے خوف یا اجتناب کی کیفیت طاری ہو گی۔ اور اس کی وجہ سے وہ وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرے گا۔ اور اس ارادہ سے اس کی قدرت اور طاقت تحریک میں آئے گی اور اگر اعضاء جسمانی قابو میں ہوئے تو اُلٹے پاؤں وہاں سے بھاگنا شروع کر دے گا۔ اور اگر یہ شخص اس جانور کو شیر نہ سمجھتا یا شیر سمجھ کر ایذا پہنچانے والی چیز نہ تصور کرتا تو برابر اپنے شوق میں اُدھر بڑھا چلا جاتا۔

اس سے یہ امر بدیہی طور پر ثابت ہوا کہ شوق اور خوف ارادہ اور اختیار طاقت اور قدرت ہاتھ اور پاؤں وغیرہ جن کے مجموعہ کو ہم قوت عملیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ سب کے سب عقل یعنی قوۃ علمیہ کے محکوم اور زیر فرمان ہیں۔ اور جب عقل مفرد قوت علمیہ کا کام نافع و مضر کی۔ شناخت

یا نیک و بد کی تمیز اور قوت عملیہ کا کام حسب اشارۂ عقل کسی عمل کا وجود میں لانا ٹھہرا تو اول کی حکومت اور دوسرے کی محکومی کے لحاظ سے ان دونوں کے مجموعہ یعنی انسان کا کل کام یہ ہوا کہ وہ سوچ سمجھ کر مفید مشاغل میں پڑے اور مضر کاموں سے بچے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ دنیا میں اعمال کی تقسیم نیک و بد یا نافع و مضر کی طرف ہو سکتی ہو۔ کیونکہ اگر عملی دنیا سے بھلے بُرے کا فرق بالکل اُٹھا دیا جائے۔ تو قوت علمیہ کے کارناموں کیلئے کوئی میدان ہاتھ نہ آئے گا۔ جیسا کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ قوت علمیہ صرف یہی کام کر سکتی ہے کہ مفید اور بہتر کاموں کا ناقص اور مضر کاموں سے انتخاب کرتے رہے۔ اور قوت علمیہ کی اس کارگذاری کے لئے دو قسم کے اعمال کا اس کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے۔

اب چونکہ یہ ثابت ہو گیا کہ اعمال کی دو قسمیں کئے بغیر انسان کی خلقت ہی بیکار رہتی ہے۔ تو اس کا بھی سراغ نکل آیا۔ کہ تمام عالم ہمیشہ سے اس پر متفق کیوں ہے۔ کہ اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں۔ نیک اور بد یا دوسرے الفاظ میں نافع اور مضر یہانتک کہ جو ملحد کسی مذہب کے قائل نہیں۔ وہ بھی افعال و اعمال کی اس بدیہی تفریق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب جو کچھ گفتگو باقی ہے وہ صرف اس میں ہے کہ اعمال میں نیک و بد اور نافع و مضر کی۔ تعیین کس طور پر کی جائے۔ یعنی یہ کس طرح معلوم ہو کہ یہ فعل اچھا ہے یا بُرا۔ اس سے راحت پہنچے گی۔ اس سے تکلیف۔ لیکن خوش قسمتی سے جو تقریر مرقوم ہوئی۔ اُس سے اس سوال کا جواب بھی کافی حد تک نکل آیا۔ کیونکہ جب عقل یا قوۃ علمیہ اس لئے پیدا ہوئی ہے۔ کہ وہ بھلے اور برے یا مفید اور مضر اعمال میں امتیاز قائم کیا کرے۔ تو یقیناً قدرت نے اس میں اس امتیاز صحیح کا ملکہ ودیعت کیا ہوگا۔ اس وجہ سے یہی رائے مضبوط معلوم ہوتی ہے کہ عقل سلیم جس کام کا حکم کرے وہ نافع ہوا اور جس سے وہ انکار یا گریز کرے اس میں کوئی مضرت ہو۔

یہاں سے اس کی بھی قوی امید ہوتی ہے۔ کہ اگر خدا کی جانب سے بندوں کی ہدایت کیلئے کچھ احکام نازل ہوں (جن کے مجموعہ کو مذہب کہتے ہیں) تو وہ بھی ہو بہو عقل کے موافق ہوں۔ ورنہ خدائے برتر کی دانائی اور متانت پر یہ الزام عائد ہوگا۔ کہ اس نے عقل کو بھی ہمارے قویٰ پر حکومت عطا کی۔ تاکہ وہ سب اس کے اشاروں پر کام کریں۔ اور رسول کو بھی حاکم بنا کر بھیجا۔ تاکہ اس کی اطاعت کی جائے اور ساتھ ہی دونوں کو متضاد بلکہ متناقض احکام بھی دیدیئے۔ جن میں سے

ایک کو قبول کرتے ہیں - تو لازمی طور پر دوسرے سے سرتابی کرنی پڑتی ہے -

غرض اب نہایت باوثوق طریقے سے یہ طے ہو گیا - کہ سچا مذہب وہی ہے - جو عقل سلیم کے مطابق ہو - اور بقول قاضی ابن رشد کے ہر اُس شخص کو جس کے پاس عقل سلیم موجود ہے - اپنی عقل سے کام لینا اور نظر و فکر کے صحیح طریقوں میں غور کرنا چاہیئے -

اور بیشک تمام قرآن اور تمام احادیث کا یہی منشا ہے کہ وہ عقل کے دستور العمل کے موافق تعلیم دیں - اور ہر انسان کی عقل جب تک کہ وہ گرد و پیش کے خیالات سے متاثر نہ ہو - اور جب تک کہ عقلی صحت کا زائل کر دینے والا کوئی مرض اس کو لاحق نہ ہو اُن ہی اچھے اعمال کی ہدایت کرے گی - جن کے رواج دینے کے واسطے خدا کے صادق القول پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں -

لیکن ان تمام مراحل کے بعد بھی ہم کو جس مرحلے کا طے کرنا ہنوز باقی ہے وہ یہ ہے کہ عقل کے ساتھ سلیم کی قید بڑھانے ~~سے~~ یہ شبہ ہوتا ہے کہ بعض عقلیں غیر سلیم بھی ہوتی ہیں - اور جب سلیم کے معنی تندرست کے قرار دیئے گئے ہیں - تو غیر سلیم اُس عقل کو کہیں گے جو مریض اور بیمار ہو -

تو یہ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ تندرست دسلیم ہا عقل کونسی ہے اور بیمار کونسی۔ آیا عقل کو بھی کوئی مرض لگ سکتا ہے۔ اور اگر بالفرض لگ سکتا ہے تو اس کا علاج کیا ہے۔ اُس کیواسطے طبیب کون ہے اور اُس کے مرض کی علامات کیا ہیں۔

صرف یہی استفسارات ہیں جواب باقی رہ گئے۔ اور ان ہی کے حل ہو جانے پر اس بحث کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو ان سوالات کا جواب سُننے سے پہلے چند مختصر امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

اول یہ کہ جو کام ایسے آلات کے ذریعہ سے کیا جائے جن میں احساس اور ادراک نہ ہو تو اس کام کا نفع نقصان اُن آلات کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس شخص سے تعلق رکھتا ہے۔ جو ان آلات سے یہ کام لینے والا ہے۔ مثلاً بڑھئی کے کام میں بسولا آتا ہے۔ اگر اس کی دھار جھڑ جائے یا لکھنے میں کاتب کے قلم کی نوک ٹوٹ جائے۔ تو یہ سب بڑھئی اور کاتب کا نقصان سمجھا جائے گا۔ بسولہ اور قلم کے حق میں نہ کوئی نفع متصور ہے۔ نہ نقصان۔ کیونکہ نفع نقصان کا وجود درحقیقت راحت اور تکلیف سے والبتہ ہے۔ اور راحت و تکلیف کو وہی اشیاء محسوس کر سکتے ہیں۔ جن میں ادراک اور شعور ہو۔ بہرحال جب آلات

کا نفع و ضرر اصل فاعل کا نفع و ضرر ٹھہرا تو قویٰ عملیہ کے کاموں میں جو کچھ نفع یا نقصان ہوگا۔ وہ فی الواقع عقل اور روح کا ہوگا۔ کیونکہ ادراک و شعور عقل و روح ہی کا خاصہ ہے۔ اور سب قوتیں اُس کے آگے بمنزلہ آلات کے ہیں۔ جیسا کہ ہم ابھی تحقیق کر چکے ہیں۔

دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے قوتِ عقلیہ اور قوتِ عملیہ کے مابین قدرت نے کچھ ایسا مستحکم رابطہ پیدا کیا ہے۔ کہ ان میں ہر ایک کے آثار دوسرے تک متعدی ہوتے ہیں۔ قوت عقلیہ کے جو آثار قوۃ عملیہ میں ظاہر ہوتے ہیں کچھ تو وہی ہیں جن کا تعلق صفت حکومت سے ہے۔ یعنی تمام قوی عملیہ کا بمقتضائے محکومیت عقل کے ایک اشارہ پر حرکت میں آجانا اور بعض آثار ایسے ہیں۔ جن میں عقل کی اس حکومت کو کچھ بھی دخل نہیں۔ جیسے غصہ کے وقت چہرہ کا تمتمانا اور آنکھوں کا سرخ ہوجانا یا خوف کیوقت جسم کا کانپنا اور رنگ کا اڑ جانا۔ ان حالتوں میں جب کسی اشتعال انگیز یا ہیبت ناک چیز کا ادراک عقل کو ہوا تو فوراً بلا ارادہ اور بلا اختیار غصہ یا خوف کے آثار جسم پر ظاہر ہو گئے۔ در آنحالیکہ حکومت کی حیثیت میں قصد اور اختیار کا پایا جانا ضروری تھا۔ علیٰ ہذا القیاس قوۃ عملیہ کیطرف سے بھی جو اثر عقل و روح تک پہنچتا ہے۔ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہی بلحاظ محکومیت اور آلہ بننے کے قوۃ عملیہ کے تمام منافع اور مضار کا

عقل کے واسطے ثابت ہونا۔ دوسرے بعض کیفیات بدنی سے عقل و روح کا بلے اختیار
کلفت یا راحت اُٹھانا۔ چنانچہ میل کچیل اور بول و براز سے جو کچھ نفیس طبیعوں
کو کدورت یا بخار درد سر وغیرہ میں کلفت یا بدن کی صفائی کی لذت اور
عافیت میں راحت ہوتی ہے۔ وہ سب اسی قسم میں داخل ہے۔ اب
جانبین سے ان نہہانی تعلقات۔ تاثیر و تاثر اور فعل و انفعال کے سلسلہ کو
دیکھ کر ہم کو قطعی طور پر یہ یقین ہو گیا کہ قوت عملیہ کے بعض اعمال قوۃ علمیہ
(یا عقل یا روح) کے حق میں مفید اور بعض مضر ہونگے۔ اور کوئی ایک
فعل بھی قوت علمیہ کا اس نفع و ضرر سے خالی نہ ہوگا۔

پس اگر کوئی ایسا کامل آدمی جس کی روح کی صحت اور عقل کی سلامتی
دلائل قویہ سے ثابت ہو چکی ہو۔ اعمال کے حسن و قبح کے متعلق کچھ فتویٰ
نافذ کرے اور ہم اپنی قوۃ عملیہ کی کارروائی اس کے خلاف پائیں۔ تو ہم
کو اطمینان کر لینا چاہیئے۔ کہ ہماری قوۃ عملیہ مضرت یا بالفاظ دیگر مرض
میں مبتلا ہے۔ اور اُسے تاثیر و تاثر کے قانون کے موافق جو قوۃ عملیہ اور عقل
کے درمیان ابھی ثابت ہو چکا ہے۔ یہ کہنا پڑیگا۔ کہ قوۃ علمیہ یعنی عقل بھی اپنی
اصلی حالت پر نہیں ہے۔ بلکہ بیماری میں پھنسی ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر عقل
تندرستی کی حالت میں ہوتی اور پوری قوۃ کے ساتھ صحیح احکام نافذ
کرتی تو قوۃ عملیہ جو ہر طرح سے اس کی محکوم اور زبردست ہے۔ ہرگز

اس کی عدول حکمی نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے بھی زیادہ ضعف اور اضمحلال عقل کا اس وقت ظاہر ہوتا ہے۔ جبکہ وہ خود بھی کسی عمل کے فوائد یا نقصانات سے واقف ہو اور شہوت کے غلبہ یا کسی نفع جزئی مُعجل سے متاثر ہو کر اپنے اصلی حکم کے خلاف قوت عملیہ سے عمل درآمد کرا دے۔ حتیٰ کہ عمل کی ممارست سے عقل ایسی پاگل بن جائے کہ اسی مرض کو صحت سمجھنے لگے۔ چنانچہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے حالات کا تتبع کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اکثر افراد اس قسم کے روحانی امراض میں مُبتلا ہوتے ہیں۔

دُور کیوں جاتے ہو اپنے زمانہ ہی کا حال مشاہدہ کر لو کہ اکثر لوگ ایسی موٹی موٹی باتوں میں جنکے بھلے بُرے سے سب واقف ہیں۔ جان بُوجھ کر خلاف عقل عمل درآمد رکھتے ہیں۔ اور خاص وہ امراض جو تپ دق کی طرح مریض کو بھی کم محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی تشخیص تو کوئی طبیب ہی کر سکے تو کر سکے۔ پھر اکثر ارواح کا یہ حال ہے کہ بچپن سے تا حیات ان علتوں میں گرفتار رہنے کی وجہ سے صحت کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوتیں۔ اور کینہ۔ حسد بخل۔ تکبّر خود پسندی وغیرہ امراض سے قطع نظر کر کے وہ عام امراض جن کو وبائی امراض کہنا چاہیئے۔ نہایت کثرت سے وقوع میں آتے رہتے ہیں۔

جس قوم کو چاہیئے دیکھ لیجئے کہ شادی، غمی اور سوائے ان کے اور معاملات میں ایسی ایسی قیود اور رسوم قبیحہ کے پابند ہیں کہ جن کے نقصانات کا دل وجان سے اقرار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر فرقہ ایک جدا جدا ہی عقاید پر دل جمائے بیٹھا ہے۔ اگر ان سارے فرقوں میں سے کسی ایک کو بھی حق پر قرار دیں تب بھی اکثر لوگ تو باطل پر ہی نکلیں گے۔

پھر اکثر اقوام کی بعض عادتیں ایسی خلاف عقل ہیں کہ جن کی قباحت تمام اہل مذاہب کے نزدیک مسلم ہے۔ ہندوستان کے رانگھڑ، گوجر اور افغانستان کے کوہستانیوں اور عرب کے بدوؤں میں چوری اور قزاقی اس درجہ مروج ہوتی ہے کہ رواج کی رُو سے ان کے خیال میں موجب طعن وتشنیع نہیں رہی۔ طوائف کی قوم میں زنا کی اس درجہ ترقی ہے کہ معیوب ہونے کے بجائے اس کو اپنا ہنر سمجھنے لگیں۔ بنیوں کی بزدلی اور بخل ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اور دوسری بعض قوموں میں شراب نوشی بے پردگی اور ترک ناموس کی یہ نوبت پہنچی ہے کہ اس کے نتائج بد برابر دیکھتے ہیں۔ مگر زبان پر نہیں لاتے۔ غرض مختصر لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ آوہ کا آوہ بگڑا ہوا ہے۔ جس کی اصلاح کی توقع بھی بہت

کم ہوسکتی ہے۔

ایسی ابتر حالت میں جبکہ کوئی عقل بھی (الا ماشاء اللہ) مرض سے خالی نہیں ہے۔ مجدد صاحبؒ نے اگر یہ فرمایا کہ نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علیحدہ ہے۔ تو ہمارے نزدیک بہت بجا فرمایا۔ کیونکہ بیمار کی طبیعت بسا اوقات ایسی اشیا کی طرف راغب ہوجاتی ہے۔ جو اس کیلئے مضر ہیں اور اُن چیزوں سے نفرت کرتی ہے۔ جو فی الواقع اس کو طبعاً مرغوب ہیں۔ بخار والا اکثر کھانے سے متنفر ہوجاتا ہے۔ اور دُنبل کی کلن یا خارش کی نوچ میں انسان اپنے بدن کو تراشنے اور کھال کے نوچنے پہ بے اختیار مائل ہوتا ہے لیکن وہ نفرت اور یہ رغبت دونوں بے محل ہیں۔ جس کا باعث یہی مرض ہوا ہے۔

اب اگر مجدد صاحب یا اور کوئی عالم یہ حکم صادر فرما دیتے کہ مذہب مرغوبات عقل سلیم کے مجموعہ کا نام ہے (اور درحقیقت ہے بھی ایسا ہی) تو ان مریض عقلوں کیواسطے آزادی یعنی مطلق العنانی کا اچھا خاصہ بہانہ ہاتھ آجاتا اور وہ ہرگز تندرست اور بیمار عقل میں تفریق قائم نہ رکھتیں۔ جس سے دنیا میں ایک فساد عظیم برپا ہوجاتا اور ہدایت کے بجائے گمراہی پھیلتی۔

بہر حال جبکہ اس امر کا باور کر لینا بالکل آسان ہو گیا۔ کہ اکثر انسانی عقلیں مبتلا امراض رہنے کی وجہ سے اس پر قادر نہیں ہیں کہ وہ تیقن اور اطمینان کیساتھ تمام اخلاق و اعمال میں نیک کو بد سے اور مفید کو مضر سے تمیز دے سکیں تو ناچار اس بارے میں کسی ایسے طبیب حاذق کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار پایا۔ جس کی رائے کبھی غلطی نہ کرتی ہو۔ جو اپنے مریضوں پر پورا پورا رحم کھانے کے علاوہ تمام دواؤں کے خواص اور اوزان سے واقف ہو جس کو مختلف دواؤں اور غذاؤں کی تاثیرات کے باریک سے باریک فرق معلوم ہوں۔ اور جس کی نظر موسموں کے اختلاف اور روح کی تراکیب پر کامل طور سے حاوی ہو۔

لیکن ایسا طبیب اس حکیم علی الاطلاق کے سوا کوئی نظر نہیں آتا جس کے سہارے تمام عالم کی ہستی قائم ہے۔ جس کی ذات ہر قسم کے عیوب اور امراض سے پاک ہے اور جس کے وجود اور کمالات کو عنقریب ایک مستقل رسالہ میں ہم روشن دلائل سے ثابت کرینگے۔

دنیا میں جس قدر ہادی آئے جن مقدس بندوں نے اپنی نبوّت کا سکہ بٹھلایا۔ جتنے سچے شریعتوں کے تبلیغ کرنے والے گذرے وہ سب کے سب اُسی حکیم مطلق کے مطب کے نسخہ نویس اور تربیت

یافتہ تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اسی روحانی کالج کی اسناد فضیلت لوگوں کو دکھلائیں اور اسی حکیم برحق کے عطا کئے ہوئے اعزازی تمغے اور نشانات پیش کئے تاکہ اللہ کی مخلوق ماہر طبیبوں کو اشتہاری حکیموں سے جدا کر سکے۔ رہبر اور رہزن کے پہچاننے میں دھوکہ نہ لگے۔ محافظوں کی جماعت پر لٹیروں کا اشتباہ نہ ہو۔

ہم جب نبوت کی ضرورت اور نبی کے تعین پر مبسوط بحث کرینگے اسوقت اُن علامات کا تفصیلاً ذکر کریں گے جن سے کسی خاص شخص کی نسبت یہ دریافت ہو سکے کہ وہ خدائی مدرسہ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دنیا میں حکیم علی الاطلاق کی نیابت کا واقعی مستحق ہے۔

مگر اس موقع پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف اتنا دکھانا چاہتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کے فیوضات اخذ کرنے اور اس کے علوم و کمالات کا مظہر بننے کے واسطے انسان میں عادۃً کن شرائط کی ضرورت ہے۔ یا بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے مدرسہ میں طب روحانی کا حصول کس استعداد پر موقوف ہے۔

بلاشبہ اس قسم کے عمیق مباحث میں دخل دینے کا ہم کو کچھ استحقاق نہیں ہے۔ اور جس وادی میں ہم قدم زن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں

اس کو بآسانی قطع کر لینے کا خیال محض ہماری فکر کے خارج از حوصلہ بلند پروازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن اُس ناواقف مسافر کو راستہ کی مشکلات کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ جس کی دستگیری کیواسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مبصر اور تجربہ کار ہادی موجود ہو۔

ہم پہلے بھی جن تیرہ و تاریک راہوں کو طے کر کے اس مقام تک پہنچے ہیں اُن میں سے گذرنا آسان نہ تھا۔ اگر قاسمی تصنیفات ہمارے لئے مشعلِ راہ نہ ہوتیں اور اب بھی انشاءاللہ آپ دیکھیں گے کہ اُن ہی کی روشنی میں منزل پیش آمدہ کے مہالک و خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم اپنے مقصد اعلیٰ پر صاف جا پہنچیں گے۔

وہ ذات بابرکات جس کی قوت قدسیہ نے شریعت صادقہ کے پیچ در پیچ اور نظری در نظری اسرار کو بھی بداہت کی حدود کے قریب لا رکھا ہے۔ اگرچہ وہ خود دنیا سے اٹھ گئے۔ مگر اُن کی قیامت تک نہ مٹنے والی یادگاریں ہماری رہنمائی کے واسطے زندہ جاوید ہیں

اس میں ہرگز مبالغہ نہیں کہ اگر حضرت مولانا محمد قاسم (روحی و ارواحکم فداہ) کی بیش بہا کتابوں پر میری دسترس نہ ہوتی۔ تو میں ہرگز اس طرح کے نازک مسائل پر بخوف و خطر قلم اٹھانیکی جرأت نہ کر سکتا۔ اس لئے یہ سخت احسان فراموشی اور خیانت متصور ہوگی

کہ ہیں کسی ایسے مضمون کو اپنی طرف منسوب کرکے جو درحقیقت حضرت مولانا مرحوم کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہو۔ اپنی غیر واقعی عظمت و تفوق کا ثبوت پیش کروں۔ میں اس سے زیادہ اپنے کو خوش قسمت اور فائز المرام بنانے کی تمنا نہیں رکھتا کہ مولانا کے عالی مضامین میرے پیرایۂ بیان میں اس طرح ادا ہو جایا کریں کہ اُن کی تعبیر میرے مدّعا کے واسطے مفید اور صحیح ہو۔ اور اپنے قصور فہم یا پریشانی تقریر کی وجہ سے دلائل کی تقریب ناتمام نہ رہے۔ چنانچہ اس وقت بھی جس بحث کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اس میں میرا صرف اسی قدر تصرف ہوگا :-

یہ بحث جس کی ابتداء سے آج ہماری تحریر کی دوبارہ ابتداء ہوئی ہے فی الحقیقت نبوّت کی بحث ہے اور ہم کو ہٹ دھرمی اور دھینگا دھینگی سے نہیں۔ بلکہ محض حق پژوہی اور انصاف کے ساتھ یہ دکھانا ہے کہ وہ پر عظمت و جلال مفہوم جس کے لئے نبی۔ رسول۔ پیغمبر وغیرہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں۔ کیا خارج میں واقعی طور پر اُس کے کچھ افراد موجود ہیں یا وہ بھی منجملہ اُن شاندار تخیلات کے ایک تخیل ہے جن کو مغلوب الوہم لوگوں کے دماغ فرصت اور تنہائی میں بیٹھکر اختراع کرتے رہتے ہیں۔

اس آخر احتمال کو سنکر جس سے شان نبوّۃ میں سخت ملحدانہ گستاخی ہوتی ہے۔ ہم کو اندیشہ ہے کہ شاید کوئی جوشیلے مسلمان ہمارے ایمان

میں تردد پیدا کر کے ہم پر ہی نہ بگڑ بیٹھیں۔ اس لئے ہم ایسے صاحبوں سے بادب عرض کرتے ہیں۔ کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنے قابل تعریف غصہ اور جوش کو ہم مسلمان ناقلین کے حق میں صرف کریں۔ بہتر ہو کہ اُن مطلق العنان دہریوں کی سرکوبی کیواسطے استعمال فرمائیں۔ جن کی زبان سے مایھلکنا الا الدھر اور ان ھی الا حیاتنا الدنیا وغیرہ الفاظ قرآن کریم سے نقل کئے گئے ہیں۔ اور جن کی ایک بڑی بھاری تعداد آج کل یورپ میں زبان قال سے اور ہندوستان وغیرہ میں زبان حال سے یہ صدائیں لگا رہی ہے۔ کہ خدا کا وجود محض ایک فرضی وجود ہے۔ نبوۃ و رسالت صرع کی بیماری کے نام ہیں۔ اعجاز و کرامات اگلے زمانہ کی نظر بندیوں کے افسانے ہیں۔ اور وحی و الہام کی حقیقت دیوانوں کی بڑ سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ یہ لوگ صرف ایک عقل کے اور وہ بھی اپنی عقل کے مشورہ کو ماننا چاہتے ہیں۔ اور اُن کے مذہب میں جادہ عقل سے ایک انچ ادھر ادھر ہٹنا کفر و شرک یا کم از کم گناہ کبیرہ کے برابر ہے۔

ہر ایسا شخص جس کو کبھی کسی مشکل مسئلہ کے متعلق افہام و تفہیم کا موقع ملا ہو گا۔ بشرطیکہ اُسکے بیوقوف مخاطب کے مسلمات بھی بہت ہی تھوڑے سے ہوں۔ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک ایسے آزاد فرقہ کی بے قید شبہات سے جس کا ذکر اوپر ہوا عہدہ برآ ہونا کس قدر دشوار مرحلہ ہے۔ اور یہ کہ ہمارے

مولائے روح رفداہ ابی واُمّی) نے ان لامذہبوں کے مقابلہ میں کس درجہ ثبات واستقلال اور معقولیت سے کام لیا ہے۔

مولانا کا اس آزاد گروہ سے صرف ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ تمام مخلوقات میں نیک و بد کا تفاوت۔ بھلے بُرے کا فرق اور اعلیٰ ادنیٰ کے امتیازی مدارج جو ہماری تمہاری سب کی عقل نے قائم کر رکھے ہیں۔ اس کا معیار اور پیمانہ عقل کے پاس کیا ہے۔ عقل نے جمادات سے حیوانات کو کیوں اچھا بتلایا ہے۔ اور تمام حیوانات کے اعتبار سے انسان کو کیوں سند فضیلت عطا کی ہے۔ جہالت کے مقابلہ میں وہ علم کی ہمیشہ کیوں مداح رہا کرتی ہے اور ہمت و شجاعت سے کارناموں کو وہ جبن و نامردی کے برخلاف کس وجہ سے سربلند رکھنا چاہتی ہے۔ المختصر وجود کو عدم پر وجودیات کو عدمیات پر ہونے کو نہ ہونے پر۔ استغنا کو احتیاج پر اور راحت کو تکلیف پر کیوں ترجیح دیتی ہے۔ وہ کونسا نمونہ اُس کے پاس ہے جس کے ساتھ مناسب و مشابہ ہونے اور نہ ہونے کی وجہ سے وہ مخلوقات میں سے ہر ایک چیز کو بھلا یا بُرا بنا دینے کا استحقاق رکھتی ہے۔

اگر تم ایک اچکن کا کپڑا کسی ہوشیار درزی کو قطع کرنے اور سینے کیلئے دو۔ یا بازار جا کر کوئی عمدہ ٹوپی اور خوبصورت جوتی خرید نے کا ارادہ کرو تو بیشک تم ان سب چیزوں کی حسن و خوبی اور موزونیت و غیر موزونیت

کو اپنی اُن آنکھوں سے دیکھ سکو گے۔ جو قدرت کی طرف سے تم کو ایسے ہی کاموں کیلئے عنایت ہوتی ہیں۔ لیکن اس دیکھنے کے اندر تم کو چند پیمانوں پر ان اشیاء کے مطابق کرنے کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً اچکن کو تم اپنے بدن پر پہنکر اور جوتی کو پاؤں میں ڈالکر اور ٹوپی کو سر پر رکھ کر دیکھو گے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز اپنے پیمانہ پر پوری نہ اُترے بلکہ ڈھیلی یا تنگ رہے تو تم اُس کو ناموزوں سمجھ کر مسترد کردو گے اور اگر اتفاق سے کوئی چیز خاطر خواہ اپنے پیمانہ پر مطابق ہوگئی تو پھر خود خیال کر سکتے ہو کہ تم کہاں تک اُس کی قدردانی کے لئے تیار ہو گے۔

ٹھیک اسی طرح عقل کے پاس بھی ہر نیک و بد کی تمیز کا کوئی پیمانہ اور بھلے بُرے کی شناخت کا کوئی معیار موجود ہونا چاہیئے۔ کہ جس پر منطبق ہونے اور نہ ہونے سے وہ ہر ایک مخلوق کے حسن و قبح کے مراتب دریافت کر سکے۔

غالباً ہر عقل کے جذر فطرت میں جیساکہ ہم عنقریب ثابت کرینگے مخلوقات کے ماسوا ایک ایسی اعلیٰ ہستی کا ادراک موجود ہے۔ جو عین وجود ہونے کی وجہ سے عدم و نیستی کا شائبہ اپنے اندر نہیں رکھتی۔ اور اسی وجہ سے وہ ہر قسم کی احتیاجات سے بے نیاز ہے وہ حی ہے۔ عالم ہر

قادر ہے متکلم ہے ارادہ اور اختیار رکھتا ہے غرض کہ تمامی عمدہ صفات کے جامع اور ہر طرح کے عیب وقصور سے بری ہے۔

اب جس حد تک عقل اپنی رسائی اور صفائی کے موافق کسی مخلوق کو اس ایک چیز سے مناسب پاتی ہے۔ اسی حد تک اس کو اعلےٰ اور افضل جانتی ہے اور جو چیز اُس سے بعید النسبت ہوتی ہے اُتنا ہی عقل اس کو پستی کی جانب دھکیلتی جاتی ہے۔ مثلاً۔

وہ عقل کے مرتبہ شناسی کا معیار (جس کو دوسرے الفاظ میں ہم خدای عزوجل کہتے ہیں۔ چونکہ وجود ہی وجود ہے۔ عدم کا اُس میں اصلاً اختلاط نہیں اسی واسطے ہماری عقل موجودات کو ہمیشہ معدومات پر ترجیح دیتی ہے۔ پھر موجودات میں بھی جس شے میں خدائی صفات کا کم وبیش ظہور دیکھتی ہے۔ اُسی حیثیت سے اس کی تفوق کو اُن اشیاء کے مقابلہ میں تسلیم کرانے لگتی ہے۔ جن میں وہ صفات نہ پائی جاتی ہوں۔

دیکھو چونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ خداوند کریم زندہ ہے بیجان نہیں۔ اور اس باب میں ہم نے دیکھا کہ آدمی اور جانور خدا تعالیٰ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ مٹی، پانی، ہوا، آگ، شجر، حجر وغیرہ نہیں رکھتے تو ہم نے جان لیا کہ حیوانات کا رتبہ جمادات سے اونچا ہے اس کے بعد خیال کیا کہ خداوند کریم عالم ہے جاہل نہیں اور ہر انسان باقی جانداروں سے علم وعقل میں ممتاز ہے

تو ثابت ہوا کہ انسان جملہ حیوانات میں اشرف و افضل ہے۔ پھر انسان بھی علم و اخلاق اور احوال و اعمال میں متفاوت اور کم و بیش ہیں۔ تو جو کوئی علم میں زیادہ ہو اور اخلاق مثل قدرت۔ سخاوت۔ حلم۔ عفو وغیرہ کے جو خدائے تعالیٰ کے اخلاق ہیں رکھتا ہو۔ وہ بلاشبہ اپنے اقران سے فائق شمار کیا جائیگا۔

بہر کیف جس چیز کو بھی عقل بھلا یا برا کہتی ہے۔ اس کو ابتداءً یا بالآخر اُسے ایک نمونہ اور معیار پر مطابق کر کے دیکھتی ہے۔ البتہ چونکہ باہم عقلوں میں تیزی اور صفائی اور توجہ کے اعتبار سے بے انتہا فرق ہے۔ اس لئے اس مطابقت اور مناسبت کے معلوم کرنے میں بھی بعید تفاوت ہونا چاہیئے۔

اب تم خیال کرو کہ دنیا کی سب چیزیں ارواح ہوں۔ یا اجسام۔ اخلاق ہوں یا اعمال معانی ہوں یا الفاظ۔ باوجودیکہ خدائے برتر سے ایک قسم کی مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ سب کی اصل وہی خالق بے نیاز ہے اور سب کا وجود اسی کے وجود کا پرتوہ ہے۔ لیکن پھر بھی اس مناسبت میں مخلوقات کے اندر زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔

ارواح کو بسبب اپنی لطافت کے جو قرب و مناسبت جناب باری عز اسمہٗ سے حاصل ہے وہ ہرگز اجسام کثیفہ کو نہیں اور اجسام میں

بھی مثلاً آگ ہوا سے لطیف ہے اور ہوا پانی سے اور پانی مٹی سے تو اسی ترتیب سے ان میں سے ہر ایک کو خدا تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ ایک طرح کا قرب و مناسبت حاصل ہو گا۔ اور شاید اسی قرب و بعد کا اثر ہے کہ لطیف چیزوں سے باوجود اس نزاکت کے وہ کارہائے نمایاں بن پڑتے ہیں۔ کہ کثیف سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ برق ایک پلک جھپکنے میں آسمان سے زمین پر آتی اور پھر آسمان پر اُڑ جاتی ہے۔ اور اس سرعت سیر و سفر میں پہاڑ بھی اگر سامنے آجائے تو اُس کی بھی ذرہ برابر حقیقت نہیں سمجھتی۔ شعاع شمس و قمر کا یہ حال ہے کہ سرعت برق بھی اُس کے سامنے گرد ہے کہاں زمین کہاں چوتھا آسمان خیال کرتے ہوئے دیر لگتی ہے۔ پر اُس کو یہاں تک آتے دیر نہیں لگتی۔

علی ہذا القیاس اپنی نگاہ کو دیکھو اور آوازوں کی تیز روی اور خیال و گمان کی رسائی کو سوچو جتنی لطافت بڑھتی جائیگی۔ اُسی قدر زور اور قدرت زیادہ ہو گی۔ جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لطیف چیزیں اپنے قرب و مناسبت کی بدولت خدا تعالیٰ کے فیضانِ کمالات سے وہ حصہ لیتی ہیں جو بعید المناسبت اشیاء کو نہیں مل سکتا اور اس کی نظیر ظاہر میں بالکل اس طرح ہے کہ شمع کا نور اُس کے آس پاس کی چیزوں کو بہت زیادہ منور کرتا ہے۔ لیکن دور کی چیزیں اُس سے اتنی روشن نہیں ہوتیں۔

پس اگر وہ اخلاق حمیدہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات بابرکات میں موجود ہیں۔ قلیل کثیر کسی فرد بشر کے نصیب ہو جائیں۔ تو بیشک بہ نسبت اُن افراد کے جن میں یہ اخلاق نہیں اُس شخص کو حق تعالیٰ سے بمقدار مطابقت اخلاق کے قرب روحانی ہو گا۔ اور جو عنایات خاصہ خدائے کریم کی اُس کے حال پر مبذول ہوں گی۔ اوروں کو میسر نہ ہو سکیں گی۔

آپ عنقریب بوضاحت وتفصیل یہ معلوم کرینگے کہ جیسے زمین و آسمان میں چاروں طرف نور آفتاب کا ظہور ہے۔ اور اسی کے ذریعے آپ سُرخ وسفید کا امتیاز اور خوبصورت و بدصورت کا فرق قائم کرتے ہیں اور ہر صحن اور ہر روشندان ہر جگہ اور ہر مکان میں جدا جدا قطع سے وہی جلوہ گری کئے ہوئے ہے۔ ایسے ہی تمام کائنات کا وجود خداوند حقیقی کے نور وجود کی پرتوہ افشانی کا نتیجہ ہے۔ تو جس طرح آفتاب عالم تاب کو با ایں ہمہ عموم فیض۔ قلعی دار آئینہ اور آتشی شیشے کے ساتھ وہ خصوصیت خاصۂ حاصل ہے کہ دوسرے اجسام کے ساتھ نہیں۔

(دیکھو۔ آتشی شیشے میں سوائے روشنی کے آفتاب کی جانب سے ایک خاص حرارت اور آتشی اثر کی بھی آمد ہے اور باقی اجسام کو جو وہیں اُس کے پاس ہی رکھے ہوں۔ اس تاثیر کی مطلق خبر نہیں۔ یا آئینہ قلعی دار میں آفتاب کی روشنی کا اس قدر اظہار ہے کہ درصورتیکہ دوسرے اجسام آفتاب سے

فیضیاب ہو کر خود ہی روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ خود بھی سورج کی طرح چمک اٹھتا ہے۔ اور جو اجسام اس کے بالمقابل ہوں اُن پر بھی اپنا پرتو ڈالتا ہے۔)

اسی طرح فیض خداوندی کو بھی عام و خاص سمجھنا چاہیئے کہ یہ فرق بجز فرق مناسبت اور فرق قابلیت کے اور کیا ہو گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جیسے آفتاب کو آئینہ یا پتھر سب برابر و یکساں ہیں۔ ایسے ہی خدائے بے نیاز کو بھی تمام مخلوقات برابر ہیں۔ کسی سے بخل نہیں۔ البتہ مخلوقات کی قابلیت اور مناسبت بے انتہا مختلف ہے۔

تو جو لوگ صاف باطن ہیں اور اپنے بنی نوع سے ایسے ممتاز ہیں۔ جیسے آئینہ لوہے سے یعنی جیسے آئینہ در اصل وہی لوہا ہے جو میل کچیل کے دُور ہو جانے کے باعث صاف و شفاف آئینہ بن گیا ہے۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی مثل اور بنی آدم کے وہ ہی حقیقت اور رُوح انسانی رکھتے ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ ان کی ارواح بوجہ نہ ہونے آلائشوں اور کدورتوں کے جو بسبب تعلقات پنہانی کے ہوتی ہیں۔ پاک و صاف ہیں۔ وہ لوگ عجب نہیں کہ بہ نسبت اپنے بنی نوع کے زیادہ معزز و ممتاز ہوں اور بعضے ایسے فیض اُن کو خدا کی طرف سے پہنچتے ہوں۔ کہ ہم کو تم کو ان کی اطلاع بھی نہ ہو یعنی ہم تم بذات خود اُن فیوضات سے محروم رہیں۔ گو اُن

ہی پاکدل لوگوں کے واسطہ سے جن کے قلوب پر اوّل وہ فیض وارد ہوتے ہیں۔ صرف اس قدر بہرہ یاب ہو جائیں۔ جس قدر در و دیوار آئینہ منوّر سے یا سیاہ و سبز وغیرہ اشیاء جو جلنے کے قابل ہوں۔ آتشی شیشے سے۔ غرض ہو سکتا ہے کہ جیسے آفتاب کے مقابلہ کے وقت آتشی شیشہ یا آئینہ قلعی دار کے باطن میں آفتاب کی طرف سے ایک فیض ایسی طرح آتا ہے کہ بظاہر آتا ہوا کچھ معلوم نہیں ہوتا اور پھر اس کے حاصل ہو جانے کے بعد وہ دونوں بھی بقدر طاقت اپنی فیض رسانی میں مطلق بخل و دریغ روا نہیں رکھتے۔ بلکہ ہر اس چیز کو جو ان کے سامنے آتی ہے اپنے حلقۂ اثر میں داخل کرنے کے واسطے تیار رہتے ہیں۔

ایسے ہی کیا عجب ہے کہ بعض بنی آدم کے دلوں پر جنکے دل جسمانی کثافتوں اور نفسانی کدورتوں سے پاک و صاف ہیں۔ ایسی حرارت محبت خداوندی نازل ہوتی ہو۔ کہ اوروں کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ اور وہ خود آتشی شیشے کی مانند اس کو پی جائیں اور تحمل کر جائیں۔ لیکن دوسروں کے دلوں میں آگ لگا کر اور ان کی ساری کدورتوں کو سوخت کر کے ایسا پاک و صاف کر دیں۔ جیسا لوہے کو جلا کر صاف و شفاف آئینہ بنا لیا جاتا ہے۔ اور پھر اس نور الٰہی سے جو مثل آئینہ کے خاص ان کے دلوں پر اترتا ہے۔ اور اترتا ہوا معلوم نہیں ہوتا اور ان کا ظاہر مثل در و دیوار

کے اور باطن مثل اس آئینہ کے جو خود آفتاب کے مقابل نہ ہو۔ مگر اس آئینہ کے مقابل ہو جو آفتاب کے مقابل ہے بکمال آب و تاب جگمگا اُٹھے۔ یعنی ان کا فیض اُن لوگوں کو جو اُن کی طرف صدق دل سے متوجہ ہوتے ہیں ظاہر و باطن میں ایسا مالا مال کر دے کہ کدورت کا نام و نشان باقی نہ رکھے اور عمدہ اعمال اور برگزیدہ اخلاق سے اُن کا اندرون و بیرون بخوبی آراستہ ہو جائے۔

ہماری خواہش اس وقت اپنے دوستوں سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدائے عزّ و جل میں (جو کہ مخزن کمالات ہے) اور چند انسانوں میں فقط ایک ایسے ہی خاص طرح کے تعلق کو مستبعد نہ سمجھیں۔ جیسا کہ انہوں نے آتشی شیشے وغیرہ کا آفتاب کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔ اگر اُن کو خالق و مخلوق کے درمیان اس قسم کے پوشیدہ تعلقات کے ممکن التسلیم ہونے میں تامل نہ رہا (اور غالباً نہ رہا ہوگا) تو پھر ہم بہت ہی تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اُن خصوصیات کو طے کر سکیں گے۔ جن سے کسی ایک یا چند معین اشخاص کی صداقت پر جو کبھی اس تعلق کے مدعی رہے ہوں کافی استدلال ہو سکتا ہو لیکن ہم ابھی تک تو اسی ورطۂ حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ مثلاً دوپہر کا وقت ہے۔ آفتاب ٹھیک نصف النہار پر ہے۔ کنکریاں۔ سنگریزے۔ درخت کی شاخیں

زمین - زمین کے ریت - سمندر کا پانی اور لوہے کے کالے کالے ٹکڑے غرض دنیا کی سینکڑوں ہزاروں چیزیں اُس کے سامنے پڑی ہوئی ہیں سورج کی روشنی میں ہر ایک شے اُن میں سے الگ الگ دکھائی دیتی ہے - اور ہر ایک میں دھوپ کی کچھ نہ کچھ گرمی بھی محسوس ہو رہی ہے لیکن ان ہی مختلف الانواع اشیا کے بیچ میں اور ان ہی کالے سیاہ آہن پاروں کے قریب ایک شخص بیٹھا ہے - جس کے ایک ہاتھ میں آتشی شیشہ اور دوسرے میں کوئی سیاہ یا سبز چادر ہے اور جب وہ اپنے شیشے کو سورج کے رو برو کر کے چادر کو اس کے مقابلہ پہ لاتا ہے - تو اسی وقت چادر میں آگ سلگ کر دھواں اُٹھنے لگتا ہے - اور جب شیشے کو سورج کے یا چادر کو شیشے کے سامنے سے سرکا دیتا ہے - تو وہ تاثیر آتشین باقی نہیں رہتی -

یہ سارا التعجب انگیز ماجرا ہم ایک انتہا سے انتہا جاہل اور متعصب آدمی سے کرتے ہیں - تو وہ بغیر کسی استعجاب کے اس کو تسلیم کرنے لگتا ہے - لیکن باوجود اس کے وہ بہت افسوسناک بیباکی کے ساتھ محال سمجھ کر تمسخر اڑانے کو جائز رکھتا ہے - جب ہم اُس سے یہ کہتے ہیں - کہ ایک خشک اور بے آب و گیاہ ریگستان میں جہاں بہت سے ایسے مختلف المذہب مختلف الطبائع اور مختلف الالوان لوگ جمع تھے - جن کے پتھریلے معبودوں کی مانند سخت و سیاہ دلوں پہ آفتاب

کمالات کی شعاعیں بھی اپنا گہرا اثر نہ ڈالتی تھیں - جن کے تہ بہ تہ مادی کثافتوں کے نیچے ان کی لطیف روحانیت نے اپنے کو چھپا رکھا تھا - اور جن کی جہالت آمیز حرکتوں اور غافلانہ بدمستیوں سے دنیا کی اخلاقی مرقع کی اصلی صورت ایسی بگڑ گئی تھی کہ پہچانی نہ جا سکتی تھی۔

دہاں پر ایک ایسا صفاکیش اور روشن ضمیر انسان ظاہر ہوا جس کے قلب میں فطری طور پر کمالات آلہی سے استفادہ کرنے کی پوری استعداد ودلیعت کیگئی تھی - اور جس نے ہوش سنبھالتے ہی بغیر کسی ظاہری معلم کے تمام گردوپیش کے خیالات سے علیحدہ ہوکر ایسی روش اختیار کی جو سیدھے معبود حقیقی تک پہنچانیوالی تھی - اس پاکیزہ سرشت انسان کو اپنے جبلی اخلاق اور برگزیدہ ملکات کی بدولت جو وہ بطن مادر سے اپنے ساتھ لایا تھا اُس منبع الکمالات خالق سے ایک خاص الخاص نزدیکی اور مناسبت قائم ہوگئی اور جس وقت وہ خدا کا پاک طینت بندہ تمام فانی تعلقات کو فراموش کئے ہوئے دل سے طلب صادق کے ساتھ خدائے ذوالجلال کی جناب میں متوجہ ہوکر بیٹھا تو نہ معلوم کس غیر محسوس راستے سے ایک ایسی گرم روشنی اس کے قلب کی تہ میں اتری کہ پھر جو دل بھی سامنے آیا اس کی ساری کدورتوں اور آلائشوں کو جلاکر کندن بنا دیا۔

کیا کوئی عقل و انصاف کا حامی ان دونوں واقعوں میں جو ہم نے ذکر کئے مادیت اور روحانیت کے فرق کے سوا اور کوئی فرق ہم کو ایسا بتلا سکتا ہے جس سے ایک واقعہ تو ہماری احمق مخاطب کے نزدیک قابل تسلیم ٹھہرا اور دوسرے کی محال اور ناممکن سمجھ کر ہنسی اڑائی گئی۔

بلا شبہ آتشی شیشہ اور آفتاب کی مثال ایک جسمانی مثال ہے جس کو ہم کسی روحانی مسئلہ کے استدلال میں بقاعدہ منطق پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ نہ ہم نے اس کو اپنا استدلال بنانا چاہا ہے اور نہ فی الحقیقت ہم کو بنانے کی ضرورت ہے۔

ہم اوائل تحریر میں یہ بتلا چکے کہ ہماری غرض اصلی اس موقع پر صرف اس قدر ہے کہ آپ خدائے بزرگ کے اور اس کے بندوں کے مابین ایک ایسے مخصوص تعلق کے ممکن ہونے سے انکار نہ فرمائیں جس کے ساتھ حضرت رب العزت کے بعض افادات خاصہ وابستہ ہوں۔ پس اگر آپ اس قسم کے تعلق کو ناممکن اور محال سمجھیں گے۔ تو درحقیقت مدعی آپ ہونگے اور استدلال و براہان سے کسی بات کا ثابت کرنا بھی بحیثیت مدعی ہونے کے آپ ہی کا منصب ہوگا۔ کیونکہ یہ بدیہی قاعدہ ہے کہ اگر کسی چیز کے وجود و عدم دہونے

نہ ہونے) کے متعلق نزاع ہو تو اُس میں مدعی وجود کا ماننے والا سمجھا جاتا ہے اور بخلاف اس کے اگر گفتگو کسی چیز کے امکان و امتناع (ہو سکنے اور نہ ہو سکنے) میں ہے تو اب مدعی وہ شخص ہے جو اُس کو ناممکن اور ممتنع سمجھے۔

اس اعتبار سے اگر میں بغیر کسی مزید توضیح کے یہ کہہ دیتا کہ بعض بنی آدم اور خدائے عزوجل میں بعض ایسے تعلقات ممکن ہیں۔ جو اُس کے اور بنی نوع میں نہ پائے جاتے ہوں تو مجھ سے کسی قسم کے مطالبۂ دلیل کا استحقاق نہ تھا۔ بلکہ مجھ کو حق تھا۔ کہ میں اپنے ان مخالفوں سے جو ایسے تعلقات کو محال کہتے ہوں حجۃ طلب کروں۔ لیکن میں نے مناظرہ کے پہلو سے درگذر کر کے محض تقریب الی الفہم اور تسکین خاطر اور رفع اضطراب کے لئے ایک محسوس مشاہد نظیر بھی اپنے مدعا کی تبرعاً پیش کر دی تاکہ جو لوگ مادیات و محسوسات کے دائرہ سے ایک قدم باہر نکالنے کے خوگر نہیں ہیں۔ وہ بھی ان غیر محسوس تعلقات کی نوعیت سے فی الجملہ واقفیت حاصل کر سکیں۔

یہ ایک اتفاقی اور بہت ہی فائدہ مند بات ہوئی کہ جب ہم خالق و مخلوق کے ان نہانی تعلقات پر بحث کر رہے تھے اور نظیروں اور مثالوں کے ذریعہ سے اُن کو دلنشین کرتے جاتے

تھے۔ تو اُس کے ضمن میں ہم کو چند ایسے اصول واسباب کے سراغ لگانے کا بھی موقع مل گیا۔ جن پر یہ تعلقات واقع ہیں متفرع ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے یہ جان لیا کہ ان تعلقات خاصہ کی بنا اُس قرب و مناسبت پر ہے جو کسی انسان کو خدائے تعالیٰ سے اپنے روحی لطافت میں کامل اور اخلاق حمیدہ سے متصف ہونیکی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص ان اعلےٰ اوصاف کے ساتھ موصوف راستی کا حامی اور کمینہ اخلاق و ذمائم سے محترز ہوگا۔ اُس کو بعید نہیں کہ بسبب قرب روحانی کے خدائے عزوجل کی جانب سے اندرونی طور پر اس قسم کے افاضات خاصہ ہوتے ہوں۔ جو اس کے دوسرے بنی نوع کو نہ ہوں۔ اور وہ اُن اسرار الہی پر مطلع ہوتا ہو جن کے دریافت کرنے سے اور لوگ عاجز رہ گئے ہوں۔ خدائے اقدس نے اپنے کمالات کا اُس کو آئینہ بنا لیا ہو اور اسی شان مرآئینہ کی وجہ سے اُس کے دل میں خدا تعالیٰ کے نہایت غامض اور دقیق مافی الضمیر بھی منعکس ہوجاتے ہیں۔

اگر فرض کرو کہ ہم کو دنیا میں کسی معتبر ذریعہ سے ایسے ایک یا چند آدمیوں کے وجود کا پتہ لگ گیا۔ جن میں یہ صفات اعلیٰ اور اکمل حیثیت کے اندر پائے جائیں۔ تو یقیناً یہی لوگ ہماری اُن

بیمار عقلوں کے درد کا درماں بن سکیں گے۔ جن کے مرض کا مفصل تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔ اور جن کی نسبت ہم نے کہا تھا کہ وہ مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے اپنے نیک و بد اور نافع و مضر میں اسی طرح صحیح تفریق نہیں کر سکتے۔ جس طرح ایک بیمار آدمی بخار کی وجہ سے عمدہ عمدہ کھانوں کو برا سمجھنے لگتا ہے۔ جو اس کو طبعاً مرغوب ہیں اور دنبل کی کلکن یا خارش کی نوچ میں اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کے نوچنے پر بے اختیارانہ مائل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ حالت صحت میں اس حرکت کو ہرگز عزیز نہیں رکھتا تھا۔

یہ اُس خدائے بے نیاز کا بہت بڑا احسان ہے کہ میں نے جس مقصد کے ثابت کرنے کے واسطے چلنا شروع کیا تھا۔ یہاں پہنچکر میں نے اس کو پالیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے آغاز سے انجام تک حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

(۱) افعال انسانی میں نیک و بد کی تقسیم ہر فرد بشر کو خواہ وہ کوئی مذہبی آدمی ہو۔ یا دہری ماننا ضروری ہے۔

(۲) عقل سلیم جس کام کو اچھا یا برا بتلائے وہ ویسا ہی ہوتا ہے اور شریعت کے احکام بھی عقل سلیم کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۳) عقل اور قوۃ عملیہ میں ایسا رابطۂ خاص ہے۔ کہ اُن میں سے

ہر ایک کا اثر دوسرے تک پہنچتا ہے۔ اور حرکات ناشائستہ اور افعال ذمیمہ کا کسی شخص سے سرزد ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس کی قوۃ علمیہ (عقل) مریض یا کمزور ہے۔

(۴) عقل سقیم (مریض) جس شے کو نافع یا مضر تبلائے اس پہ اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اس بارہ میں عقل سلیم درکار ہے۔

(۵) ہر ایک چیز کے حسن و قبح سے کماحقہٗ خدا تعالیٰ ہی واقف ہو سکتا ہے۔ یا وہ شخص جس کو خدا تعالیٰ محض اپنے فضل و عنایت سے جس حد تلک واقف کر دے۔

(۶) خدا تعالیٰ کے فیوض و عنایات خاصہ سے ہر ایک انسان بقدر اپنے قرب و مناسبت کے مستفید ہوتا ہے۔

(۷) جس قدر کوئی عقل لطیف یعنی نفسانی آلائشوں اور مادی کثافتوں سے پاک و صاف ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق کے ساتھ مزین ہو گی۔ اسی قدر اسکو خدائے عزوجل سے قرب و تعلق حاصل ہو گا۔ اور ایسی ہی عقلوں کو ہم عقول سلیمہ کے نام سے یاد کرنیکے مستحق ہوں گے۔

ان صاف و صریح مگر مہتم بالشان نتائج کے سمجھ لینے کے بعد صرف یہ ہی نفع نہیں ہوا کہ ہم اپنے ایک خاص مقصد میں بقدر ضرورت کامیاب ہو گئے۔

بلکہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر پر جو کچھ نکتہ چینیاں پہلے کی گئیں تھیں۔ اُن میں سے اکثر کا جواب بھی ضمناً اسی بیان سے نکل آیا۔ چنانچہ جن ناظرین کو امام ممدوح کی تقریر اور اُس کے متعلق شبہات یاد ہونگے۔ وہ خود ہماری پوری تقریر پہ مکرر نظر ڈالکر امید ہے کہ ہر ایک شبہ کا جواب دریافت کر لیں گے۔

البتہ سر سید کے اس اعتراض کا کوئی جواب ہمارے مضمون میں ابھی تک نہیں آیا کہ جب عموماً لوگوں کی عقلیں مبتلائے امراض ہونے کی وجہ سے صحیح و فاسد اور نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتیں۔ اور نہ وہ ہر ایک بھلے بُرے کے پہچاننے کے واسطے کافی ہیں۔ تو ہم کو خدا تعالےٰ کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا۔ حالانکہ انسان اپنے ذی عقل ہونے ہی کی وجہ سے تمام حیوانات کے برخلاف شرعیات کا مخاطب قرار دیا گیا ہے۔

اس کا جواب مختصراً تو صرف اتنا ہی ہے۔ کہ شریعت نے جن چیزوں کے سمجھنے یا کرنے کی جس حد تک تکلیف دی ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ہمارے حیطۂ قدرت سے خارج نہیں ہے۔ اور ہمارے ذی عقل ہونے اور اپنے ابناء جنس سے ممتاز بننے کا یہ نفع کافی ہے۔ کہ ہم خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر مطلع ہو کر اپنے جملہ ارادات اور حرکات

وسکنات کی باگ اُن دونوں کے ہاتھ میں دیدیں۔ اور اجمالاً یہ جان لیں کہ جن دونوں کی صداقت کا ہم کو یقین ہو چکا ہے۔ وہ بلاشبہ ہمارے کامل خیر خواہ اور کامل حکمت والے ہیں۔ اور اُن کی ہر ایک چھوٹی سے چھوٹی تعلیم پہ کاربند ہونا ہمارے لئے فلاح و سودمندی سے خالی نہیں ہے اگرچہ ہم اُن کل احکام کی یا اُن میں سے بعض کی تفصیلی حکمتوں اور مصالح پر مطلع نہ ہو سکے ہوں۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک ماہر ڈاکٹر جب کسی دوا یا غذا کے متعلق مفید یا مضر ہونے کا فتویٰ دیتا ہے۔ تو ہم خواہ اس چیز کے خواص و کیفیات بلکہ نام سے بھی صحیح طور پہ آشنا نہ ہوں۔ اور خواہ جس کے استعمال کا وہ حکم دیتا ہے اس سے نفرت اور جس سے وہ منع کرتا ہے۔ اس کی طرف رغبت بھی ہو مگر ڈاکٹر کی تجربہ کاری اور بہی خواہی پر اعتماد کر کے جس کو ہم نے محض ایک کمزور اور ضعیف گمان کے ساتھ تسلیم کر رکھا ہے۔ ہم اُس دوا یا غذا کے استعمال کی نسبت اپنا سابق رویہ بدل ڈالتے ہیں اور اس تبدیلی کے وقت بیچاری عقل کی ایک بھی نہیں سنتے۔ بلکہ یوں تاویل کر کے تسلی کر لیتے ہیں۔ کہ عاقلوں کی پیروی بھی درحقیقت عقل کی ہی پیروی ہے۔ تو اس حیثیت سے گویا ہم نے عقل کے اشارہ کے بغیر کوئی جنبش نہیں کی۔

یہ ہی حال بعینہٖ مذہب و شریعت کا ہے۔ لیکن ہم کو تعجب کے ساتھ افسوس ہوتا ہے۔ کہ سر سید نے ایک نرالی منطق سے اور عجیب گول مول الفاظ میں لوگوں کے دلوں سے ہمارے اس صحیح خیال کو مٹانا یا کم از کم سست کر دینا چاہا ہے جس جگہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمارا یہ اصول نہایت جنچا ہوا ہے کہ انسان صرف بسبب عقل کے جو اس میں ہی مکلف ہوا ہے۔ پس جس بات پر وہ مکلف ہوگا ضروری ہے کہ فہم انسانی سے خارج نہ ہو ورنہ معلول کا وجود بغیر علت کے لازم آتا ہے جو محال و ممتنع ہے۔ پس جن اخلاق کے پکڑنے اور چھوڑنے پر انسان مکلف ہے وہ ضرور عقل انسانی سے خارج نہیں"[1]

میرا یہ سوال سر سید سے ہے کہ جس عقل کو وہ تکلیف شرعی کے واسطے علت قرار دیتے ہیں اس سے کیا مراد ہے آیا فقط قوۃ ادراک کا انسان میں موجود ہونا یا اس سے ہر ہر چیز کو تفصیلاً جاننا۔ اگر پہلی صورت اختیار کی جائے تو بعض احکام و اخلاق کے فوائد و علل پر مطلع نہ ہونے سے علت و معلول میں جدائی کس طرح لازم آئی اور اگر خدانخواستہ سر سید نے دوسری شق کو لیا ہے تو میں تسلیم نہیں کرتا کہ جو علت تکلیف کی سر سید نے قرار دی ہے۔ وہ صحیح ہے۔ اور آپ حیرت کرینگے جب یہ سنیں گے کہ جیسا

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد دوم مطبوعہ لاہور مضمون کاشش صہ ۱۲۳

کہ میں اس شق کو تسلیم نہیں کرتا۔ خود سرسید بھی اس کے اعتراف کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اُسی مضمون کے دوسرے حصہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

"اس بیان سے جو ظاہرا بالکل سیدھا اور صاف ہے اور کج اور پیچ اُس میں کچھ نہیں ہے۔ اتنی بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ کانشنس فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں ہے اور نہ وہ ابتداءً کسی مذہب کا اصل اصول قرار پانے کے لائق ہے اور نہ وُہ فی حد ذاتہ رہنما ہونے کے مستحق ہے۔ ہاں بلاشبہ سچے اصُول پر انسان کی طبیعت تربیت پا جائے یا سچے خیالات سے اس کی طبیعت موثر ہو جائے اور طبیعت سچائی کے مطابق حالت پیدا کرلے تب وہ حالت طبیعت یعنی کانشنس انسان کا رہنما ہوتا ہے"[1]۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہاں یہ سچ ہے کہ قانون قدرت پر غور اور فکر کرنے سے وہ صحیح اخلاق جو انسان کی طبیعت کو ایسی حالت پر کر دیں جو کبھی دھوکہ نہ دے دریافت کر سکتے ہیں۔ مگر کب جبکہ انسان کی معلومات کو ایک کافی ترقی اور قوانین قدرت پر اور اُن مختلف قوتوں کے اوپر جو اُس کے بانی نے انسان میں رکھے ہیں۔ ایک معتدبہ

---

[1] تہذیب الاخلاق صفحہ ۱۲

آگاہی حاصل ہو۔ تمام انسان اُن دقائق پر نہیں پہنچ سکتے۔
اور جو پہنچ سکتے ہیں وہ معدودے چند کے سوا نہیں ہو سکتے
اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں
در صدیوں میں پس اس لئے تاکہ اُس قادر مطلق کی حکمت بیکار
نہ رہے۔ ضرور ہوا ہے کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانہ کی حالت
کے لحاظ سے ایسے ہادی پیدا کئے جائیں جن میں خلقی ایسا مادہ
دیا گیا ہو اور جو باعتبار اپنی فطرت کے اُن سچے اخلاق کے
بیان کا مخزن ہو۔"[1]

ان دونوں عبارتوں سے بھی اور اُن کے اور بعض تصریحات سے بھی
یہ ثابت ہو گیا کہ جملہ احکام شرعیہ کے لم اور علّت کو سمجھ لینا گو مطلق
عقل انسانی سے خارج نہیں ہے۔ لیکن ہر عقل شخصی کا یہ منصب بھی
نہیں کہ ہر ایک حکم کی حقیقت اور نکتہ کے سمجھ لینے کا وہ دعویٰ کر بیٹھے
تو سرسیّد کے اصول کے موافق سوال یہ ہے کہ سوائے اُن معدودے
چند انسانوں کے جو دقائق شریعت سے خبردار ہوں۔ (جیسا کہ سرسیّد
بزعم خود تھے) اور لوگوں کو جو ایسے نہیں ہیں مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا
حالانکہ جن باتوں کے کرنے یا چھوڑنے پر اُن کو برانگیختہ کیا جاتا ہے

---

[1] تہذیب الاخلاق صہ ۱۲۲

وہ ان کی عقلِ شخصی سے یقیناً خارج ہیں۔

پس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ہم گرفتاران ہوا و ہوس اور مریضان عقل و ادراک ان ارباب عقول سلیمہ کو جن کے کچھ کچھ اوصاف ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اطباء روحانی سمجھ کر اپنے لئے کم از کم اسی طرح موت دائمی اور ہلاکت ابدی سے نجات دلانیوالا تصور کر لیں۔ جیسا کہ ایک جاہل بیمار جو لغرض تداوی کسی طبیب حاذق کے آستانہ پر حاضر ہو کر اُس کی نسبت خیال رکھتا ہے۔ اور جس طرح ایک دیہاتی مریض اپنے معالج ڈاکٹر کے کہنے سے فقط اس اعتماد پر کہ وہ اس کے خواص اور منافع و مضار سے کماحقہٗ آگاہ ہو گا۔ کونین کے (بلکہ کسی نامعلوم الاسم دوا کے) کھانے کے لئے بلا پس و پیش آمادہ ہو جاتا ہے۔ (حالانکہ ذاتی طور پر وہ اس سے کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتا) ٹھیک اسی طرح ارباب عقول سقیمہ کو لازم ہے کہ وہ ارباب عقول سلیمہ کے احکام کے سامنے بالکل گردن ڈالدیں اور اُن نسخہ جات کے استعمال کرنے اور پرہیز کے قائم رکھنے میں جن کا ارباب عقول سلیمہ نے امر فرمایا ہو۔ ایک لمحہ کیلئے بھی توقف۔ تردد اور تنگدلی کو دخل نہ دیں۔ بشرطیکہ طبیب کے طبیب اور ان نسخہ جات کے یا مر طبیب ہونے میں ان کو کوئی شبہ باقی نہ رہ گیا ہو۔

فلا و ربّک لا یؤمنون حتّیٰ | پس قسم ہے تیری پروردگار کی کہ یہ لوگ ایمان

یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (پ ۵: ع ۶)

سے ہرگز بہرہ یاب نہیں ہو سکتے تا وقتیکہ تم کو (اے پیغمبر) اپنے باہمی منازعات میں حکم نہ ٹھہرا دیں اور پھر تمہارے فیصلہ کے سامنے بغیر کسی قسم کی دلی تنگی کے گردن تسلیم خم نہ کر دیں

ممکن ہے کہ یہ سوال اٹھایا جاوے کہ جب ارباب عقول سقیمہ کو محض اپنے عقلوں پر اعتماد کرنا اور ان کی ہدایات اور احکام پر چلنا ہی روا نہیں رہا۔ اور نہ کسی شرعی معاملہ میں ان کے اقتضاآت عقلیہ کی توثیق و تصویب ضرور قرار دیئے گئے تو آخر اس کے باور کر لینے کی ہی ہمارے پاس کیا ضمانت ہے۔ کہ عقل سلیم و سقیم کے امتیاز اور طبیب و مریض کی تشخیص اور نہ معالج و مستعلج کی جستجو میں وہی مریض عقلیں صحت و استقامت کے ساتھ ضرور کامیاب ہو جائیں گی۔ اور اس کا احتمال باقی نہ رہیگا۔ کہ جس شخص کو انہوں نے تندرست شمار کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت بیمار ہو اور جس کو اپنا نجات دہندہ طبیب سمجھتے ہیں۔ وہ ایک نا اہل اور خطرہ جان بلا کو ہو۔

لیکن ایسا سوال پیش کرنے والوں کو تھوڑی دیر کے واسطے اس پر غور کرنا چاہیئے۔ کہ اگر کسی اجنبی بستی میں کوئی اجنبی طبیب آ جائے اور وہاں کے لوگوں سے اپنے فن کی حیثیت میں تعارف پیدا کرنا چاہے (حالانکہ وہ لوگ نہ تو نظریات طب سے خبردار ہیں اور نہ انواع مرض سے واقفیت

رکھتے ہیں اور نہ اُن کے لئے طرق علاج کی صحت و غلطی کا دریافت کرنا آسان کام ہے) تو ایسی صورت میں اس طبیب کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونیکے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ سب سے پہلے تو وہ مجامع و مجالس میں موقع بموقع اپنے طب ذاتی کا تذکرہ کریگا۔ اپنے مطب پر ایک بڑا سا سائین بورڈ لگائیگا اور وقتاً فوقتاً اپنے اسانید کو جو کسی معتبر مدرسہ سے اس کو دستیاب ہوئے ہونگے۔ خواص کے روبرو پیش کرتا رہے گا۔ اور اس کے بعد کچھ لوگ تو عام چرچا سُنکر اور محض شہرت پر ایمان لاکر اور کچھ محض امتحان اور جانچ کرنے کی نیت سے اور کچھ طبیبوں کے احوال و اطوار سے قدرے واقفیت رکھنے کی وجہ سے اُس کے پاس لغرض معالجہ آنے لگیں گے۔ اور بہت سے مریضوں کے پاس اپنا اعتبار بڑھانے اور مطب کو چمکانے کیلئے وہ بذات خود بغیر کسی قسم کی فیس اور مالی معاوضہ کے دور دراز کے تعلقات خیال کر کے چلا جائے گا۔

اب اس ساری جد و جہد اور دوادوش میں اگر کچھ بیماروں کی شفا اُس کے ہاتھ سے مقدر ہے۔ تو وہ اُس کی اولین کامیابی کا باعث ہو گی۔ اور جوں جوں کہ یہ سلسلہ ترقی کرتا جائے گا۔ اسی قدر اس کی عزت اور مقبولیت کو چار چاند لگتے جائیں گے۔ انتہا یہ ہے۔ کہ وہ

کچھ زمانہ کے بعد شہرت عامّہ کے اس درجہ پر پہنچ جائے گا۔ کہ مریضوں کو اُس کے یہاں پہنچنے کیلئے استدلال اور غور و فکر کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اور عوام کے محاورات میں شفا و صحت تو اس کے معالجانہ کوششوں کی طرف اور موت و ہلاکت خالی بخت و اتفاق یا مشیت ایزدی کی طرف منسوب ہونے لگے گی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ دوسرے نئے طبیبوں کی مقبولیت کا معیار ہی اب اس کی تسلیم و تصدیق قرار پا جائیں گے۔

بعینہ اسی پر اطبا روحانی (انبیا علیہم الصلواۃ والسلام) کے حالات کو قیاس کرو جب وہ عالم کی ہدایت و اصلاح کیلئے مبعوث ہوتے ہیں تو سب سے اوّل وُہ اپنے من اللہ بشیر و نذیر ہونے کا نہایت زور شور اور تحدی کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اپنی دعوت و تبلیغ کا غلغلہ اہل و عیال اور خویش و اقارب سے شروع کر کے مشارق و مغارب میں ڈال دیتے ہیں۔ جس کو سُن کر کچھ لوگ تو اُن کے سابق چالیس سالہ زہد و ریاضت پاک و صاف اخلاق۔ دیانت و راستبازی اعراض عن المال والجاہ شرافت حسب و نسب اور روشن خوارق یا آیات بینات وغیرہ امور کی وجہ سے اور بہت سے محض از راہ امتحان و تفتیش ہی فطرۃً اُن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سے وہ خوش قسمت ہیں کہ خود انبیاء علیہم الصلواۃ والسلام اپنی قوت قلبیہ اور ہمت باطنی کے

زور سے باذن اللہ ان کو اپنی طرف جذب کر لیتے ہیں اور اسی اثناء میں جب یہ لوگ روحانی امراض سے یکایک شفایاب ہونے لگتے ہیں اور ان کے دلوں کی تاریکی دور ہو کر جمال خداوندی کا عکس اُن میں پڑنے لگتا ہے۔ تو وہ اپنے ہادی کی نسبت فوراً چلا اُٹھتے ہیں کہ :-

ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم (پ ۱۲ ع ۱۴)
نہیں یہ شخص آدمی یہ تو کوئی فرشتہ ہے بزرگ۔

اس وقت ان مریضوں کو بھلا چنگا دیکھ کر اور انکے حالات سابقہ میں ایسا انقلاب عظیم پا کر اوروں کے دل بھی نرمانے لگتے ہیں۔ اور اُن کو ان کی صحت کی بحالی پر رشک آنے لگتا ہے۔ پھر تو مخلوق خدا فوج در فوج اور جوق درجوق ہو کر اُس پاک بندے کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اور اپنے اپنے امراض کا مرافعہ اس کی طرف کرتی ہے۔ اور جیسے جیسے کہ یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے اندھوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور غافلوں کو عبرت حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آتا رہتا ہے۔ اُس کے بعد اُس کے طبیب حاذق یا نبی مرسل سمجھنے کے واسطے نہ کسی استدلال کی ضرورت رہتی ہے اور نہ اُس میں بہت زیادہ تدقیق اور غور و خوض کو کام فرمانے کی

الغرض جس وقت طبیب حاذق (نبی) کی شناخت کیلئے انسان کو اپنے دماغ پہ کچھ زور ڈالنے کی ضرورت تھی۔ اُس وقت تو چند قدرتی اسباب کی بنا پر یہ شناخت بغیر زور ڈالے ہی حاصل ہو گئی۔ اور اب جبکہ اُس کے حذاقت کے نتائج متمثل ہو کر گویا آنکھوں کے سامنے نمودار ہو گئے ہیں۔ تو اس بحث میں کدو کاوش کی مطلقاً حاجت ہی باقی نہیں رہی۔ ہر شخص اُن محسوس و مشاہد نتائج کو دیکھکر اسی طرح اُس کے طبیب حاذق (نبی) ہونے کا یقین کر سکتا ہے۔ جیسا کہ کسی گھر کے صحن میں دھوپ نکلی ہوئی دیکھکر آسمان پر آفتاب کے نکلنے کا۔

اور اس بدیہی بلکہ اجلی البدیہیات کے سمجھنے کے واسطے انسان میں ذرا سی عقل بھی خواہ وہ کتنی ہی علیل کیوں نہ ہو۔ کفایت کرتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس سے کام لینے کی کوشش کرے اور حق کے دیکھنے سے جو اُس کو حمٹنا چاہتا ہے۔ بالکل آنکھیں بند نہ کر لے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ ارباب عقول سقیمہ سے یہ مطلب ہمارا ہرگز نہیں ہے کہ اُن میں کسی موٹی سی موٹی اور روشن سے روشن بات کے سمجھنے کی بھی قابلیت باقی نہ رہی ہو۔ اور محسوسات کے ادراک کی استعداد بھی اُن سے سلب کر لی

گئی ہو۔

تم خود خیال کرو کہ کسی تجربہ کار طبیب کے ہاتھ پر تپ کہنہ کے پانچ چار مریض (جو زندگانی سے مایوس ہو چکے ہوں) شفایاب ہو جائیں تو گھر گھر میں اُس کا چرچا پھیل جاتا ہے اور دور دراز شہروں کے مایوس العلاج بیمار اُس کی طرف رجُوع کرنے لگتے ہیں اب اگر فرض کرو کہ ایک طبیب کے دست شفا سے کوئی بستی کی بستی یا ملک کا ملک تپ کہنہ سے صحت یاب ہو جاوے تو اُس کی طرف لوگوں کی توجہ کیا کسی منطقی استدلال کے محتاج رہے گی۔

مثلاً سرخیل اطبائے روحانی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم (جیسا کہ ہم نے اپنے رسالہ الاسلام میں نہایت مفصل بیان کیا ہے اور یہاں پر مصلحتاً ہم اپنے زمانہ کے ایک (اصلاحی) روشن خیال مؤلف کے الفاظ میں لکھتے ہیں۔) ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جبکہ دُنیا ایک عجیب روحانی سکتے کی حالت میں تھی۔ اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے۔ جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمّہ کی گئی جو سوائے اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط راہوں اور وحشیانہ اعمال اور بداخلاقی اور نفاق اور جنگ جوئی کے کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتے تھے۔ مگر

آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے ان پر ایسی عجیب و غریب تاثیر کی کہ اس سے ان کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدل گئیں برسوں کے بھٹکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے اور مدتوں کے سوتے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے ——— جو مشرک تھے وہ موحد ہو گئے جو کافر تھے ایمان لائے جو بت پرست تھے وہ بت شکن بن گئے - جو گمراہ تھے وہ خدا کی راہ دیکھنے لگے جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا ان میں نام نہ رہا - خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں - دماغ غرور و نخوت سے خالی ہو گئے - اور ان کے دل صبر و توکل - حلم و بردباری - زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے - آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست پاک طبیعت راستباز نیک دل لوگوں کا قائم کر دیا - جن کی کوششوں سے شرک و بت پرستی کی آواز جو تمام جزیرہ نمائے عرب میں گونج رہی تھی بند ہو گئی اور اس کے بدلے ایک بیچوں دیچگوں بے شبہ و بے نمول خدا کی منادی پھر گئی - بتوں نے عدم کا راستہ لیا - بتخانوں کا نشان مٹ گیا - آتشکدے ٹھنڈے پڑ گئے - تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا - اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا -

جاء الحق و زھق الباطل   حق ظاہر ہو گیا - اور باطل مغلوب

ان الباطل کان زھوقا (پ ۱۵ ع ۹) بلا شبہ - باطل مغلوب ہی ہو کر رہتا ہے -

کیا اس سے اس امر کا مشاہدہ اور درخشان ثبوت نہیں ملتا کہ آپ حقیقت میں سچے رسول الطبیب حاذق اور خدا ہی کی طرف سے موید تھے - ورنہ انسان کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت میں پیدا کر دیتا اور ایسے جنگ جو ستم پیشہ لوگوں کو جو بات بات پہ لڑتے اور جھگڑتے تھے - اخوت کے ایک رشتہ میں باندھ دیتا اور اُن کی پشتینی عداوتوں اور کینوں سے اُن کے دلوں کو ایسا صاف کر دیتا کہ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہتا - بلکہ دُنیا میں اخلاق اور انسانیت کا نمونہ بنا دیتا -

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی ایسی عجیب و غریب تاثیر اور ایسے حیرت انگیز نتائج کو دیکھ کر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرت سے خارج تھی - چنانچہ کوئی اُن میں سے کہتا ہے کہ " وہ پیام جو آپ لائے وہ ایک سچا اور حقیقی پیام تھا جس کا مخرج وہی ہستی تھی - جس کی تھاہ کبھی کسی نے نہیں پائی " کوئی لکھتا ہے کہ " قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے - جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو " متعصب سے متعصب

عیسائیوں میں سے سخت متعصب یہ اقرار کرتا ہے کہ " دین مسیحی کی ابتداء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک کبھی حیات روحانی ایسی برانگیختہ نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی "

پھر کیا ایسے ایسے واشگاف ثبوتوں اور کھلی کھلی دلیلوں کے بعد بھی کوئی محروم البصیرۃ ایسا نکلے گا جو باوجودیکہ اپنے کو مریض سمجھتا ہو اور کسی نباض اور ماہر طبیب کی طرف رجوع کرنے کا خواہشمند بھی ہو۔ لیکن طبیب عرب (نہیں بلکہ طبیب عرب وعجم) کے ان چمکتے ہوئے کارناموں سے منہ پھیر لے اور اس کی تجویز اور تشخیص کے سامنے (جو لاریب خدا کی ہی تجویز و تشخیص ہے) بے چون وچرا اور بے ریب و تردد گردن نہ ڈالے اور کم از کم تجربہ ہی کے طور پر اس کے بتلائے ہوئے تدابیر ومعالجات و پرہیز پر چند روز عمل کرکے نہ دیکھے۔

ایسے ہی کوردباطنوں کی نسبت (جو ابھی تک اس طرح کی بدیہی صداقت کے تسلیم کے واسطے نہایت پیچیدہ اور دور از کار مسائل و دلائل کی تلاش میں فضول سرگرداں رہ کر عمر عزیز ضائع کر رہے ہیں۔ اور دن سے زیادہ روشن واقعات کی طرف آنکھ نہیں اٹھاتے) عارف باللہ حضرت شیخ محی الدین بن العربی قدس اللہ سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

" ہمارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انسان اہر بات

ہیں) خدا کو چھوڑ کر محض اپنی نظر و فکر کی ہی تقلید کرے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اُس کی یہ فکر بھی خود اسکی ذات کی طرح ایک امر حادث اور مخلوق ہے اور اُن قویٰ میں سے ایک قوۃ ہے جو خدائے تعالیٰ نے انسان کے اندر ودلیعت کی ہیں۔ (اُسے معلوم ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے قوۃ مفکرہ کو عقل انسانی کیواسطے ایک خادم بنایا ہے۔ (لیکن اس پر بھی) عقل خود اُس کی (خادم بنکر) پیچھے ہو لیتی ہے۔ باوجودیکہ یہ وہ بھی جانتی ہے کہ قوۃ مفکرہ جو کچھ اس کو عطا کرتی ہے۔ وہ اُس میں اپنے حد و مرتبہ سے ذرا بھی تجاوز نہیں کر سکتے۔ اور وہ اس سے عاجز ہے کہ کسی دوسری قوت کی سرحد میں قدم رکھ سکے۔ مثلاً قوت حافظہ یا مصورہ کا کام اُس سے نکل سکے۔ یا قوت متخیلہ کے قائم مقام بن سکے۔ یا حواس خمسہ (لمس۔ طعم۔ شم سمع۔ بصر) میں سے وہ کسی ایک کے فرائض کو انجام دے سکے۔

یہ سب کچھ ہے اور قوت مفکرہ کی حدود و اختیارات کی یہ تنگی بھی سب کو معلوم ہے۔ مگر اس پر یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے۔ کہ عقل انسانی اپنے پروردگار کی معرفت کے بارے میں اُسی فکر ناقص کی تقلید پر اڑی ہوئی ہر اُس کا پروردگار خود جو کچھ اپنی کتاب میں اور اپنے رسول کی زبانی اپنی نسبت بیان فرماتا ہے۔ اسی کی تقلید سے برابر کتراتی ہے۔

عالم میں جو غلطیاں مختلف طرح کی پھیلی ہوئی ہیں۔ عقل کی یہ غلطی اُن

سب میں عجیب تر ہے اور تماشہ ہے کہ سوائے ان معدود لوگوں کے جن کی بصیرت کی آنکھیں خدا تعالےٰ نے روشن کر دی ہیں۔ ہر صاحب فکر اسی عام غلط کاری میں مبتلا ہے۔ ہاں ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں۔ کہ خداوند تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک خاص فطرت بنائی (اور اسی خاص فطرۃ کے اعتبار سے اُس شے کی عمل و حرکت کی حد بندی کر دی ہے، مثلاً قوت سامعہ (یا کانوں کی فطرت) مسموعات (آوازوں) کے ادراک سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اور عقل انسانی فقط اسی حلقہ میں اسکے محتاج اور آوازوں کی شناخت حروف کے قطع و برید۔ الفاظ کے تغیرات اور لغات کی تقسیم میں اس سے امداد کے طالب ہے۔ چنانچہ عقل انسانی قوۃ سامعہ ہی کے ذریعہ سے پرندوں کے چہچہے۔ ہواؤں کی سائیں سائیں کواڑوں کی چوں چوں۔ پانی کی خرخر۔ انسان کی چیخ و پکار اور دوسرے جانوروں کی بولیوں میں تفریق کرتی ہے۔ ورنہ عقل انسانی میں بجائے خود یہ قدرت کہاں کہ بغیر توسط سمع کے ان چیزوں کے باہمی امتیازات کو قائم رکھ سکے۔

اسی طرح قوت باصرہ (آنکھوں کو خیال کرو کہ اس کا دائرہ عمل محض مبصرات (دکھائی دینے کے قابل چیزوں) تک محدود ہے یعنی عقل کو اُس کی امداد کے بغیر سبزی کو زردی سے اور زردی کو سفیدی سے اور

سفیدی کو سیاہی سے اور اسی طرح ہر ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے جدا کرنا عادۃً ممکن نہیں ہے اور یہی حال ان دونوں کے ماسوا دوسری ان تمام قوتوں کا ہے۔ جو حواس کے نام سے مشہور ہیں۔ اور نیز قوت خیالیہ کا جس کو اپنی کارگذاری میں حواس خمسہ کی احتیاج ہے۔ کیونکہ تخیل فقط ان چیزوں کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے۔ جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس قوت حافظہ اگر خیال کی حاصل کی ہوئی اشیاء کو روکے نہ رکھے تو خیال کے خزانہ میں کچھ بھی باقی نہ رہے۔ اس حیثیت سے جیسا کہ وہ حواس خمسہ کا محتاج ہے۔ ایسے ہی قوت حافظہ سے بھی بے نیاز نہیں۔ پھر قوت حافظہ کے ضعف اور اُس سے امور کثیرہ کے فوت ہونے کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس لئے ایک قوت مذکرہ کی حاجت ہوئی۔ جو قوت حافظہ کی مددگار بنکر اس کو وہ باتیں یاد دلادیا کرے۔ جن سے ذہول ہو گیا ہو۔

ان سب کے بعد قوت مفکرہ خیال کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ تاکہ قوت مصورہ کے توسط سے خیال کے حاصل کردہ امور کو اس طور پر ترکیب دے کہ اُس سے کسی دعویٰ کے متعلق ایسی دلیل پیدا ہو جاوے جس کی انتہا اُن محسوسات اور بدیہیات پر ہوتی ہو۔ جو آدمی کی جبلت میں مرکوز ہیں۔ اس طرح سے جب فکر دلیل کو ایک اچھی معقول صورت پر قائم کر دیتا ہے۔ تو اب